جلد ۶۴ ، عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اکتوبر ۱۹۶۴ء

اسلام کے نظامِ سیاسی پر معرکہ آرا تصانیف

اسلامی ریاست

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر۔
- علماء و طلباء قانون و سیاست کے لیے ایک تجزیۂ علم

قیمت قسم اعلیٰ بارہ روپے سستا ایڈیشن آٹھ روپے

سُنّت کی آئینی حیثیت

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- سُنّت کیا ہے؟
- سُنّتِ نبوی کا دین میں صحیح مقام کیا ہے؟
- سنّتِ نبوی کی صحت و حفاظت کا ثبوت
- منکرینِ حدیث و سُنّت کا مسکت و مدلل جواب

آفسٹ کی حسین کتابت و طباعت قیمت ۸/۵۰ روپے

تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان

— از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- قبل تقسیم مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حالت کا نقشہ۔
- مسلمانانِ ہند کیلئے صحیح نصب العین اور طریقۂ کار کی نشاندہی۔
- برِصغیر ہند و پاک کی پچاس سالہ ہنگامہ خیز سیاست پر بے لاگ تبصرہ

حسین کتابت و طباعت رنگین ڈسٹ کور قیمت صرف ۱۰/- روپے

الجہاد فی الاسلام

— از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلل و مستند کتاب۔
- اسلامی قوانینِ جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانینِ جنگ سے ما
- اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

قیمت قسم اعلیٰ ۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۵/۰۰ روپے

نظامِ اسلامی — مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

— مرتبہ: مولانا خلیل حامدی صاحب —

- مراکش سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام کے ممتاز رہنماؤں کی نگارشات کا مجموعہ۔
- ملتِ اسلامیہ کے جسدِ خوابیدہ کو دعوتِ انقلاب و عمل
- معاندینِ اسلام کا بھرپور اور مدلل جواب۔

۵۰۰ صفحات سے زائد۔ قیمت صرف ۶/۵۰ روپے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

— از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلامی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں؟
- اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق اور موازنہ
- اسلامی تہذیب کی برتری پر مدلل تفصیلی بحث

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/۷۵ روپے

" سستا " ۳/۰۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	اکتوبر ۱۹۶۴ء	جلد ۶۲

اشارات — عبدالحمید صدیقی — ۲

تفہیم القرآن:

المؤمن (۴م) - حٰم السجدہ — ابوالاعلیٰ مودودی — ۱۷

مقالات:

مزدور تحریکوں کے متعلق جماعت اسلامی کی پالیسی — " " — ۳۵

معرکۂ حق و باطل — جناب ابن نذیر صاحب ایم۔ اے — ۴۳

مطبوعات — ادارہ

قیمت فی پرچہ	دفتر رسالہ ترجمان القرآن	سالانہ چندہ
۷۵ پیسے	۵-اے- ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور	سات روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ - لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جماعت اسلامی کی بحالی کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دیگر زعماء کی رہائی کے بالکل غیب سے سامان پیدا کر کے اپنی خاص رحمت اور تائید کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں جن کے ذریعہ ہم اپنے دلی احساسات کا اظہار کر سکیں۔ ہم اُس مالک الملک کے حضور میں دعاگو ہیں کہ وہ ہمیں ہمیشہ حق و صداقت کے راستے پر گامزن رکھے اور آخرت میں ہماری ساری کوتاہیوں اور لغزشوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہمیں یومِ حشر کی ذلّت و خواری سے بچائے اور اُن لوگوں کے زمرے میں شامل کرے جو اُس کی نظرِ کرم کے مستحق ہیں۔

جماعت اسلامی اور اُس کے قائد کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوا ہے وہ اگرچہ ایک دلخراش داستان ہے اور برسرِ اقتدار طبقے کی غیر حقیقت پسندانہ بلکہ متقمانہ ذہنیت کی پوری طرح غمازی کرتا ہے لیکن اس کے باوجود مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس ملک کے سیاسی افق پر بلاشبہ بڑی تیزی کے ساتھ تیرگی پھیل رہی ہے مگر اس تاریک فضا میں روشنی کے بہت سے مینار موجود ہیں جو بڑی پامردی کے ساتھ تاریکیوں کی مزاحمت کر رہے ہیں اور اُن کے غلبے کی ہر کوشش کو ناکام بنا رہے ہیں۔

نور کے اِن مختلف میناروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سب سے

زیادہ منظم، سب سے زیادہ درخشاں اور سب سے زیادہ تابناک مینار خود "دینِ حق" ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس وقت اس نور نے اس برِعظیم میں اپنی حیات آفریں کرنیں پھیلانی شروع کیں اس وقت اس میں وہ تابناکی باقی نہ رہی تھی جو ہمیں حضور سرورِ کائنات اور آپؐ کے جلیل القدر رفقاء کے مبارک دور میں نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اس ملک کی پوری فضا کو منور کر دیا۔ اس شمع کے روشن ہوتے ہی یہاں کے ظلمت کدوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ انسان کے فکر و نظر پر تنگ نظری، تعصب اور جہالت کے جو پردے صدیوں سے پڑے ہوئے تھے اس نے انہیں چاک کیا۔ یہاں کے لوگ اسی کی بدولت زندگی اور اس کے حقیقی مسائل پر آزادانہ غور کرنے کے قابل ہوئے۔ اُن کی نظر میں وسعت، فکر میں بلندی اور نقطۂ نگاہ میں حقیقت پسندی پیدا ہوئی۔ اسلام کی آمد کے بعد اہلِ ہند کے افکار و نظریات اور اُن کے معاشرتی ڈھانچوں میں جو عظیم تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ سب اسی "نور" کی رہینِ منت ہیں

اسے مسلمانوں کی اپنی کوتاہی اور بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس ملک میں سات سو سال حکمران رہنے کے باوجود اس کے سارے باشندوں کے قلب و دماغ پر اسلامی تعلیمات کے نقوش پوری طرح مرتسم نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلام میں دلوں کو مسخر کرنے کی قوت نہ تھی، بلکہ اس ناکامی کا بڑا سبب خود مسلمانوں کا طرزِ عمل تھا۔ وہ جس دین کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اُن کی زندگیاں اُن کے اس دعوے کی پوری طرح تائید نہ کرتی تھیں۔ اُن کی سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں میں جاہلیت کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ جب کسی دین کے علمبردار ہی اُس کے معاملے میں یکسو نہ ہوں تو اس دین کے متعلق دوسرے لوگوں کا اندازِ فکر بڑی حد تک بدل جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر یہ نظریۂ حیات سراپا خیر ہی ہے تو آخر اس کی محبت اور پیروی کا دم بھرنے والے اسے پوری طرح کیوں نہیں اپناتے۔ اس طرزِ استدلال میں خواہ کتنا ہی منطقی سقم ہو لیکن لوگ بالعموم اسی نہج پر سوچتے ہیں

اسلام کو دینِ حق تسلیم کرنے کے باوجود اُس سے نیم دلانہ وابستگی نے اگرچہ ہمارے لیے بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں، اور خصوصاً مسلمان بادشاہوں اور امراء کے طرزِ عمل سے ہماری تاریخ کا رُخ کسی دوسری سمت مڑ گیا ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ پاک و ہند کے مسلمانوں کی زندگی صرف اسی دین کے دامن میں پناہ لینے کی وجہ سے محفوظ رہی ہے۔ اس کی مقناطیسی قوت نے ہماری ملّت کے مائل بہ انتشار اجزاء کو باہم مربوط رکھا، اس کے معاشرتی نظام نے اسے دوسری اقوام سے الگ اور ممتاز کر کے اُسے ایک مستقل ملّی وجود عطا کیا۔ پھر اسی سے مسلمانوں نے ہر گام پر زندگی کی حرارت حاصل کی۔ آپ اس برِّ عظیم میں اگر مسلم قوم کی زندگی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اسلام ہی وہ واحد سہارا تھا جس سے اس کا چراغ مخالفتوں اور مخاصمتوں کے طوفانوں میں گھِر کر بھی مسلسل جلتا رہا۔ پھر یہ معاملہ صرف اُس کی بقا تک ہی محدود نہیں۔ اس کے اندر ترقی کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لانے کے لیے جتنی تحریکات اٹھیں اُن کی تہ میں ہمیشہ ایک چُبھتا ہوا احساس موجود رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ اُس نقشے کے مطابق مرتب نہیں ہوا جو ہمیں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیا تھا۔ یہ چُبھتا ہوا احساس ہماری زندگی کی سب سے قیمتی متاع ہے جس نے ہمیں اسلام سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہونے دیا۔ اکبر کے خلاف مجدد الف ثانیؒ کی جدّ و جہد، اور کفر کی بڑھتی ہوئی یلغار کے مقابلے میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا جہاد سب اسی مقدس احساس کے مختلف مظاہر ہیں۔

ممکن ہے بعض حضرات اس جذبہ کی غیر معمولی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف نہ ہوں۔ لیکن انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ قوموں کی زندگی میں اس قسم کے احساسات و جذبات بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اقوام کی زندگی انہی احساسات سے وابستہ رہتی ہے تو یہ بات زیادہ صحیح ہو گی۔ سوچیے کہ آخر وہ کونسا جذبہ تھا جس نے ہمیں ہندو

قوم کے اندر مُدغم ہونے سے بچاتے رکھا؟ وہ کونسا احساسِ زیاں تھا جس سے بے تاب ہوکر ہم نے وقت کے جباروں اور قہاروں کے خلاف ٹکر لی اور اس کے نتیجے میں جان و مال اور عزت و آبرو تک لٹا ڈالی۔ اگر اسلام کی عظمت کا نقش ہمارے دلوں پر ثبت نہ ہوتا اور اس کی محبت تمام دوسرے رشتوں پر غالب نہ ہوتی تو آج ہمارا بھی حشر انہیں اقوام کا سا ہوتا جنہوں نے اپنے نصب العین کو بھلا کر خود فراموشی جیسے جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔

قوموں کی زندگی روایات سے عبارت ہوتی ہے، نصب العین کی محبت اُن کے اندر آگے بڑھنے کی تڑپ اور اپنی قوتوں کو ایک راہ پر لگانے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اور مقصد کا عشق راستے کی ساری مزاحمتوں اور دشواریوں کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ جو قوم اپنے سامنے کوئی واضح نصب العین نہیں رکھتی وہ قوم نہیں بلکہ راکھ کا ایک ڈھیر ہے جسے ہوا کے تھپیڑے جس طرف چاہتے ہیں اڑا کر لے جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے لیے ماضی کو نظر انداز کر کے ذرا قیامِ پاکستان کے بعد کے واقعات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ اس دین نے ہمیں کس قسم کے خطرات سے بچایا ہے۔

پاکستانی قوم جن عناصر پر مشتمل ہے اُن کے درمیان سوائے اسلام کے اور کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ ہمارے ملک میں نہ جغرافیائی وحدت موجود ہے نہ لسانی وحدت۔ ہمارے ہاں رنگ و نسل کا بھی کوئی اشتراک نظر نہیں آتا۔ اسلامی روایات کے سوا کوئی ایسی روایات بھی ہمارے پاس نہیں جن سے وابستگی ہمارے اندر احساسِ یگانگت پیدا کرے۔ ہر طرح کے بے شمار اختلافات کے باوجود ہم محض اللہ کے فضل سے ایک متحد اور باہم مربوط قوم ہیں، کیونکہ اسلام کے مضبوط رشتے نے ہماری ملت کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے

اس ملک پر گزشتہ چند سالوں میں جس قسم کے مصائب نازل ہوئے ہیں اور حکمران

طبقوں نے مختلف اوقات میں اس کے جذبات کو جس بے دردی کے ساتھ کچلا ہے انہیں یہ قوم محض اسلام کی محبت کی وجہ سے برداشت کرتی رہی اور مضمحل اور مایوس ہونے کی بجائے نہایت حوصلہ شکن حالات میں بھی دین کے خلاف ہر قسم کے حربوں اور سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے پوری جرأت کے ساتھ جدوجہد کرتی رہی۔

اسلام مسلم قوم کی قوت کا واحد سرچشمہ ہے۔ اُس کی تابندہ روایات اس کی زندگی کے ہر گوشے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اس کی رگ رگ میں اسلام کے اثرات اس طرح گہرے اُترے ہوئے ہیں کہ کوئی طاقت انہیں کھُرچ کر نہیں نکال سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو گروہ بھی اس تاریخی قوت کو نظر انداز کرکے کوئی قدم اٹھاتا ہے وہ ناکام ہو جاتا ہے اور آئندہ بھی جو ایسا کرے گا وہ لازماً نامراد ہو کر رہے گا۔ اس قوت کا اندازہ کرنے کے لیے عقل کی کوئی زیادہ مقدار درکار نہیں صرف یہ دیکھیے وہ حضرات جنہیں اس ملک میں بلاشرکتِ غیرے کئی سال تک اقتدار حاصل رہا اور جنہوں نے اپنی قوت و طاقت کے زعم میں اسلامی شریعت کے اندر "اصلاح" کے بعض ایسے "انقلابی کارنامے" انجام دیئے جن کی جرأت انگریز بھی نہ کر سکتا تھا، وہ بھی آج عوام کے سامنے اپنے آپ کو نادم پاتے ہیں اور انھیں بار بار اس امر کا یقین دلا رہے ہیں کہ وہ اپنی ان انقلابی "اصلاحات" کو واپس لینے پر آمادہ ہیں۔ ان لوگوں کے وعدوں میں کس حد تک صداقت ہے اس سے ہمیں اس وقت کوئی بحث نہیں۔ اس کا فیصلہ تو بطنِ مستقبل میں پنہاں ہے۔ یہاں ہمیں صرف اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ خوش قسمتی سے ہمارے پاس اسلام کی شکل میں ایک ایسا نصب العین موجود ہے جس کی روشنی میں ہم بھلے اور برُے کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں، اپنی منزل کے خطوط متعین کر سکتے ہیں اور اپنے افعال و اعمال اور حسن کارکردگی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر ہماری رہنمائی کے لیے اسلام کا نور نہ ہوتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم ضلالت کی کن خطرناک اور تاریک وادیوں میں بھٹکتے پھرتے۔

اسلام کے بعد دوسری چیز جس کی ہمیں دل وجان سے قدر کرنی چاہیے اور جس کے خلاف ہر قسم کی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے ہمیں سر دھڑ کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کرنا چاہیے وہ جمہوریت ہے۔ یہ انسان کی بڑی خوش بختی ہے کہ اس نے صدیوں کے ناقابلِ بیان مصائب اٹھاکر اور جان و مال کی بے شمار قربانیاں دے کر رائے عامہ کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے ایک پُرامن راستہ دریافت کیا ہے۔

فکر وعمل کے اس عظیم انقلاب کے پیچھے صرف ایک احساس ہی کارفرما ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان اُس کے خالق و مالک نے جو شرف عطا کیا ہے وہ اُسے حاصل ہو، اور اس شرف کی بنا پر اُسے جو حقوق فطرت کی طرف سے ملے ہیں اُن سے کوئی شخص یا ادارہ اس کو محروم نہ کرسکے۔

آپ اگر تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانیت کے مختلف طبقات کے درمیان جو کشمکش اول روز ہی سے چلی آرہی ہے اُس کی تہ میں ان حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ اہلِ غرض، خواہ کسی مرتبہ اور مقام پر ہوں، انسان کے ان بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالتے رہے اور دوسری طرف انسان نے سب سے زیادہ زحمت انہی کی حفاظت کے لیے اٹھائی۔ اس کشمکش کے مظاہر یُوں تو ہمیں مذہب، تجارت، معیشت اور معاشرت، غرض زندگی کے سارے شعبوں میں دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا میدان سیاست رہا ہے۔ کسی ملک کے اندر چند مقدس مستثنیات کو چھوڑ کر جب کوئی فرد یا طبقہ اقتدار کے تخت پر متمکن ہُوا تو اُسے سب سے زیادہ اس بات کی فکر دامنگیر ہوئی کہ جس بلند و بالا منصب کو اُس نے حاصل کرلیا ہے، وہ کسی نہ کسی طرح اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے حق میں محفوظ کرلے اور دُوسروں پر اس کے دروازے قطعی بند کردے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے انسانوں کو شرفِ انسانیت سے محروم کرنا ضروری سمجھا تاکہ وہ بھیڑ بکریوں کا ایک گلّہ بن جائیں جنہیں اقتدار کی لاٹھی اپنی منشا اور مرضی کے مطابق جس طرف چاہے ہانک کرلے جائے اور اُن کے

دل اپنی اس بے بسی پر نہ تو مضطرب اور پریشان ہوں اور نہ ہی اس ظالمانہ روش کے خلاف ان کے اندر کوئی تحریک پیدا ہو۔

دوسری طرف نوعِ بشری نے بحیثیت مجموعی جس چیز کے تحفظ کے لیے سب سے زیادہ قربانی دی ہے وہ یہی شرفِ انسانیت اور اپنے بنیادی حقوق کا تحفظ ہے۔ وہ بیچاری بسا اوقات حالات کے ہاتھوں بے زبان جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی، لیکن اُس کی فطرت اس ذلت کے خلاف ہمیشہ بغاوت کرتی رہی اور اُسے اس بات پر اُبھارتی رہی کہ وہ اس پست اور ذلیل مقام کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہو۔

اس کشمکش کی صورتیں حالات کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ تاہم تحفظِ حقوق کی جدوجہد کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ جاری رہی، یہاں تک کہ انسان نے صدیوں کی محنت اور قربانی کے بعد اپنے حقوق کو حکمران طاقتوں سے پُوری طرح تسلیم کروا لیا اور انہیں اس حقیقت کے ماننے پر مجبور کر دیا کہ انسان کی حیثیت سے حاکم و محکوم سب برابر ہیں، اُن کے فطری حقوق پر کوئی شخص یا طبقہ دست درازی کرنے کا مجاز نہیں اور اُن کی رائے ہی ملک کے انتظام و انصرام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

ان امور کے طے ہو جانے کے بعد پھر یہ سوال حل طلب تھا کہ رائے عامہ کو ملک اور قوم کے اندر موثر قوت بنانے اور اُس کی بالادستی قائم کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس معاملہ کو بھی بڑی مصیبت اور بڑی جانفشانی سے طے کیا گیا۔ رائے عامہ کو غالب آنے کے لیے بے شمار مزاحمتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ہر موقع پر نہ صرف جان و مال کا غیر معمولی زیاں ہوتا بلکہ ملک کا امن و امان تباہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس مقصد کا حصول چونکہ آرام اور سکون کے ساتھ امن پسندانہ فضا میں ممکن نہ تھا اس لیے لوگ مشتعل ہو کر رائے عامہ کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے۔ دوسری طرف برسرِ اقتدار طبقے پُوری

شدت کے ساتھ ان کے راستے میں مزاحم ہوتے اور جبر واستبداد کے سارے ہتھکنڈے استعمال کر کے ان کی راہ روکتے۔ اس کا اثر یہ ہوتا کہ تبدیلی کے یہ جذبات کسی تعمیری مقصد میں صرف ہونے کے بجائے چڑ اور ضد سے بہک کر تخریب کی راہ پر پڑ نکلتے جس سے ملک کی پوری فضا شعلۂ جوالہ بن جاتی اور اس کے اثرات انقلاب کے بعد مدتوں قائم رہتے۔

کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور کوئی عذاب نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر اپنے حقوق کا پورا پورا شعور موجود ہو اور معاشرے میں اُن کی بنیادی اہمیت کو پوری طرح تسلیم بھی کر لیا جائے لیکن جن لوگوں پر ان حقوق کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہو وہ انہیں ہر وقت غصب کرنے کے درپے رہیں اور قدم قدم پر قوم کو ان کے تحفظ کے لیے حکمرانوں سے دست و گریباں ہونا پڑے۔ اس قسم کے مخدوش بلکہ روح فرسا حالات میں افراد یا جماعتیں اپنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں آخر کس طرح لگا سکتی ہیں۔ تعمیری کام پُرامن اور سازگار ماحول کا طالب ہے، ایسا ماحول جو ہر قسم کی بیکار کشاکش سے یکسر پاک ہو اور جس میں مختلف طبقوں کے درمیان منافرت اور حقارت کے جذبات کے بجائے تعاون کا جذبہ کارفرما ہو۔ جس معاشرے کی ساری قوتیں بار بار شرف انسانیت تسلیم کروانے اور انسانی حقوق کو منوانے میں صرف ہوتی رہیں، اُس میں لوگوں کی تعمیری صلاحیتیں کس طرح پروان چڑھ سکتی ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں ہر وقت سر پھٹول رہے، جہاں انسانیت کے دشمن انسانی شرف کے درپے آزار رہیں۔

جہاں ڈر اور خوف کے بل بوتے پر اجتماعی نظم قائم ہو اور جہاں لوگوں کو اپنے بنیادی حقوق کے بارے میں بھی کوئی یقین اور اطمینان نہ ہو وہاں کسی تعمیر کا خیال پریشان خیالی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ انہی تلخ حقائق کے احساس کا نتیجہ تھا کہ انسانوں نے اگر ایک طرف انسانی شرف کے

تحفظ کے لیے پیہم اور مسلسل جدوجہد کی تو دوسری طرف انہوں نے رائے عامہ کو پُرامن طریق سے غالب لانے کے لیے دستوری اور آئینی جدوجہد کا ایک ایسا راستہ تلاش کیا جس کے ذریعہ بڑے امن کے ساتھ، کوئی خون بہائے بغیر، حکومت میں قوم کی خواہش اور مرضی کے مطابق تبدیلی لائی جا سکے۔ یہ انسانیت کی انسان دشمن طاقتوں پر ایک عظیم فتح تھی جس سے پوری آدمیت کو بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ چنانچہ آج اس امر کا فیصلہ کہ اقتدار کے تخت پر کون لوگ متمکن ہوں، قاضیٔ شمشیر کی بجائے رائے عامہ کی عدالت سے طلب کیا جاتا ہے اور اس کا دیا ہوا فیصلہ بڑی آسانی کے ساتھ نافذ ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کی جو قوت رائے عامہ کو غالب کرنے میں صرف ہوتی تھی اُسے اب دوسرے تعمیری کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ انسانیت کا ایک ایسا قابلِ قدر تجربہ ہے جس سے ہمیں پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خوش قسمتی سے ہم اس تجربہ سے نہ صرف پوری طرح آشنا ہیں بلکہ اس کی خوبیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اس کے عملی پہلوؤں سے بھی پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں۔

پھر ہمیں اُن بدنصیب ممالک کا حشر بھی معلوم ہے جہاں حکومت میں تبدیلی ووٹ کے بجائے شمشیر کے ذریعہ لائی جاتی ہے۔ دوسرے ممالک کو تو فی الحال نظرانداز کیجیے۔ خود مسلم ممالک کی تشویشناک صورت حال کو دیکھیے کہ وہاں کے عوام کو حکمرانوں اور برسرِ اقتدار طبقوں کی تبدیلی کے لیے ہر قدم پر آگ اور خون کے کس خوفناک سمندر میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ انقلاب کی جب کوئی ہلکی سی لہر بھی اٹھتی ہے تو وہ ان بدنصیب ممالک کے لیے کسی روشن مستقبل کا پیغام لانے کے بجائے بربادی کا پیغام لاتی ہے۔ تغیّر کی معمولی جنبش کے ساتھ ہی دیوِ استبداد بالکل بدمست ہو کر حرکت میں آ جاتا ہے اور ایسے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے کہ جن سے درندوں کی گردنیں بھی ندامت سے جھک جائیں۔ پھر اس جبر کا ردعمل

شروع ہوتا ہے اور انتقام کی آگ کچھ مدت اندر ہی اندر سلگ کر اچانک بھڑک اٹھتی ہے اور ایک ملک کی پوری انسانی آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ جن باشندوں پر ہمیشہ ڈر اور خوف مسلط رہے، جن کے جذبات ہمیشہ متلاطم رہیں اور جن کے ذہنوں میں بجز انتقام کے اور کوئی چیز موجود نہ ہو ان کی حالتِ زار کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

ہم اپنے پاکستان کے حکمرانوں اور یہاں کے عوام سے بڑی دردمندی کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ براہِ کرم کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے یہ ملک بھی آمریت کی راہ پر چل نکلے اور اقتدار کی تبدیلی ہمارے لیے بھی وہی مصائب پیدا کر دے جو آج دوسرے مسلم ممالک کو درپیش ہیں۔

اس ضروری اصلاح کی ذمہ داری سب سے پہلے حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ملک اُن کی کوئی میراث نہیں بلکہ اس کی سربراہی کا منصب ان کے پاس محض ایک امانت ہے۔ اُن کی حیثیت مالک کی نہیں بلکہ امین کی ہے۔ قوم جب تک اپنی آزاد مرضی سے اُن پر اعتماد کرے اسی وقت تک انہیں اقتدار کے تخت پر متمکن رہنے کا پورا پورا حق ہے۔ مگر جس وقت قوم اُن پر اپنا اعتماد کھو بیٹھے اور وہ ان کی جگہ کسی دوسرے گروہ کو یہ امانت سونپنا چاہے تو برسرِ اقتدار طبقے کو اس راہ میں قطعاً حائل نہ ہونا چاہیے بلکہ بڑی خوشی کے ساتھ رائے عامہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ تختِ اقتدار پر متمکن حضرات کو اس بات کا پورا اختیار ہے کہ وہ اپنے کارناموں سے عوام کو آشنا کریں، اپنی خدمات کی قدر و قیمت سے انہیں آگاہ کریں اور اس طرح انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنی مرضی سے ملک کی زمامِ کار اُن کے ہاتھ میں پھر سونپ دیں۔ لیکن انہیں اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تنقید کی آواز کو دبائیں، یک طرفہ پروپیگنڈے سے عوام کو دھوکہ دیں، صحیح حالات پر پردہ ڈالیں، غلط باتیں زبردستی باور کرائیں اور ناجائز تدابیر سے رائے عامہ کے غالب آنے میں مزاحم ہوں۔ اس معاملے میں معمولی سی

لغزش اور کوتاہی بھی ملک وملت کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے کیونکہ اس قسم کے حربے عوام کو بسا اوقات نہایت خطرناک راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ برسرِ اقتدار طبقے اگر ملک کے حقیقی بہی خواہ اور اُس کی ترقی اور خوشحالی کے دل وجان سے آرزومند ہیں تو انہیں تختِ اقتدار سے چمٹے رہنے کے بجائے عوام کو اس بات کے پورے مواقع فراہم کرنے چاہییں کہ وہ اپنی منشا کے مطابق جس گروہ کو چاہیں اختیارات کی باگیں سونپ دیں تاکہ یہ تبدیلی بغیر کسی ادنیٰ مزاحمت کے عمل میں لائی جا سکے

اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انتخابات ہمیشہ ایک معیّنہ مدّت کے بعد، اور بغیر کسی دباؤ کے منعقد کیے جاتے رہیں۔ حکمراں گروہ کو جب اس امر کا احساس ہو کہ اُسے قوم نے یہ امانت ایک خاص مدت کے لیے سونپی ہے اور اس کے گزر جانے کے بعد اسے قوم کے سامنے اپنا دفترِ عمل پیش کرنا ہے تو اُس کے دل میں لازمی طور پر رائے عامہ کا احترام پیدا ہوتا ہے اور وہ کوئی کام محض حکمرانی کی ترنگ میں آکر کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اُس کے سارے کارنامے اُس کے ذاتی نظریات اور رجحانات کے بجائے عوامی رائے کے ترجمان ہوتے ہیں اور اُس کی سرگرمیاں ذاتی مفادات کے گرد گھومنے کے بجائے اجتماعی مفادات کے لیے وقف ہو جاتی ہیں۔ جب حاکم ومحکوم کے مفادات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں تو اُن کے تعلقات کشیدگی اور منافرت کے جذبات پر استوار ہونے کے بجائے محبت اور اخلاص کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کے بجائے ایک دوسرے کے نزدیک آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکمران طبقہ یونانی دیوتاؤں کی طرح اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر محلات اور ایوانوں کے اندر سنگینوں کے پہرے میں رہنا گوارا نہیں کرتا بلکہ عوام کے قریب آکر اُن کے دل کی دھڑکنوں کو سنتا ہے، اُن کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور انہیں اپنی مشکلات اور اُن کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے

دوسری طرف عوام حکمرانوں کو اپنے اور اپنے مفادات کا دشمن سمجھنے کے بجائے انہیں اپنا حقیقی خیر خواہ اور جاں نثار خیال کرتے ہیں۔ انہیں اُن کی دیانت، امانت اور اخلاص پر پورا پورا بھروسا ہوتا ہے اور وہ اس بات کے لیے اُن کے ممنونِ احسان ہوتے ہیں کہ انہوں نے محض قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر یہ بارگراں اٹھایا ہے۔ اس لیے وہ حکمرانوں کی ہر آواز پر دل وجان سے لبیک کہتے ہیں، ہر قدم پر اُن کی معاونت اور دستگیری کرتے ہیں اور ہر مشکل میں اُن کا پُورے خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹاتے ہیں۔

جمہوریت انسانوں کی اُسی آبادی میں پنپ سکتی ہے جہاں لوگوں میں اپنے حقوق و فرائض کا احساس ہو اور انہیں رائے عامہ کی بالادستی قائم کرنے کے مواقع میسر آئیں۔ آج اگر پاکستان میں جمہوری روایات اچھی طرح پروان نہیں چڑھیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس ملک کے باشندوں نے شرفِ انسانیت کو تیاگ دیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان روایات کو پوری طرح نشوونما پانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس ناکامی کی سب سے زیادہ ذمہ داری اس ملک کے حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ ان حضرات نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ یہاں اقتدار کا سرچشمہ عوام کے بجائے نوکر شاہی طبقہ ہے اس لیے انہوں نے عوام کو اعتماد میں لینے کے بجائے جوڑ توڑ اور سازش کے ذریعہ کسی نہ کسی طرح تختِ اقتدار پر قبضہ کیا اور پھر انتظامیہ کے بل بوتے پر لوگوں پر حکومت کرنی شروع کر دی۔ ان کے اس غلط طرزِ عمل کا پورے ملک اور اس کے سارے طبقوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

تختِ اقتدار قوم کی قوت وطاقت کا مرکز بننے کے بجائے نہایت گھٹیا قسم کی سازشوں کا اڈا بن گیا۔ حکمرانوں کے دل سے رائے عامہ کا احترام بالکل جاتا رہا اور انہوں نے عوام کی خدمت کے بجائے اُن لوگوں کی جائز و ناجائز سرپرستی شروع کی جو انہیں کسی طرح اقتدار کی

کرسی پر مسلط کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن ملازموں کا اصل کام ملک کو بیرونی خطرات اور اندرونی خلفشار سے بچانا تھا وہ ان سازشوں میں براہِ راست شریک ہو گئے اور انہوں نے اپنے حدود سے تجاوز کر کے وہ کارہائے نمایاں انجام دینے شروع کر دیئے جو دراصل ان کے فرائض اور اختیارات سے بالکل خارج تھے۔ جو شخص یا طبقہ اپنے اصل فرائض کو چھوڑ کر اپنے ذمہ کچھ دوسرے غیر ضروری کام لے لیتا ہے وہ کسی دائرہ میں بھی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اس سے اس کی استعداد کار میں کمی آ جانا بالکل ناگزیر ہے۔ چنانچہ اس ملک کی انتظامی مشینری کا بھی یہی حشر ہوا۔ وہ حضرات جن کے سپرد مختلف شعبوں کا انتظام و انصرام تھا انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں صرف کرنے کے بجائے دھڑے بندیوں میں کھپانا شروع کر دیا اور اس طرح ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ آپ اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں ایک عام شہری کی زندگی کس طرح عذاب بنتی جا رہی ہے۔ جن کارندوں کو لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا فرض سونپا گیا ہے، ان کا بیشتر وقت برسرِ اقتدار گروہ کے مفادات کی پاسبانی میں صرف ہوتا ہے اور اس لیے وہ اُن ذمہ داریوں کی طرف توجہ دینے سے قاصر ہیں جن کی بجا آوری کے لیے انہیں عوام کے خزانے سے معاوضہ دیا جاتا ہے۔ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھیے آپ کو سماج دشمن عناصر کی ستم رانیوں کے بیسیوں واقعات ایک ہی صفحہ پر نظر آئیں گے۔ غریب اور بے سہارا عورتیں راہ چلتے اٹھالی جاتی ہیں اور پھر ان کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ بے گناہ لوگ دن دہاڑے قتل ہو جاتے ہیں اور قاتلوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ بدنصیب بچے ہر روز اغوا کیے جاتے ہیں، اُن کے والدین اُن کی جدائی میں گھل گھل کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن انہیں اپنے ان جگر گوشوں کا دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ کیا ان معصوم کلیوں کو آسمان اچک لیتا ہے یا زمین نگل جاتی ہے؟ آخر ان کا کیوں کوئی کھوج نہیں ملتا؟ جو پولیس اقتدار سے اختلاف کرنے والوں کے پیچھے ہر وقت سایہ کی طرح لگی رہے اور اس معاملے میں اس کی کارکردگی کا یہ عالم ہو کہ ان کی کوئی حرکت اس کی خوردبین نگاہوں سے

بچ نہ سکے اُس کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اُجڑے ہوئے گھروں کو اُن کے اغوا شدہ بچے اور بچیاں واپس دلا کر انہیں آباد نہیں کر سکتی۔ اور جو سماج دشمن عناصر اس قسم کے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ہمت نہیں رکھتی۔ وہ اگر اس معاملے میں ناکام ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اس کام کی اہلیت اور استعداد نہیں رکھتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے بعض ایسے کاموں میں الجھا دیا گیا ہے جو اُس کے فرائض میں کسی حیثیت سے بھی داخل نہیں ہیں۔

نیک اور اچھے مقاصد اچھے طریقوں ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ جب اقتدار جوڑ توڑ، سازش اور دھاندلی سے حاصل کیا جائے تو اس کے لیے بے ضمیر، اخلاق سے عاری، طالع آزما اور غنڈے لوگوں کی خدمات نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ اقتدار کے حریص تختِ اقتدار پر فائز ہونے کے ساتھ ہی ایسے لوگوں کی تلاش شروع کر دیتے ہیں جن کا نہ کوئی ضمیر ہو اور نہ ایمان۔ جو صاحبِ اقتدار کے ہر کام پر خواہ وہ اخلاقی، دینی یا قومی نقطۂ نظر سے کتنا ہی غیر مفید اور غلط ہو، تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسانے کے لیے تیار رہیں اور اُس کے لُطف کو کسی تلخ اور ناگوار بات سے کرکرا نہ کریں۔ بلکہ اُسے ہر وقت یہی باور کراتے رہیں کہ حضور کی نگاہ سے زیادہ دُور رس کوئی نگاہ نہیں، حضور کی فراست سے زیادہ کسی کی فراست نہیں اور حضور کے تدبر سے زیادہ دنیا میں کسی اور کا تدبر نہیں۔ حضور ملت کی کشتی کے واحد ناخدا ہیں اور اگر خدانخواستہ حضور اس کام سے دستکش ہو گئے تو پھر اس ناؤ کو طوفانوں کی زد سے کوئی دوسرا بچا نہ سکے گا۔ اس طالع آزما طبقے کی روش میں اتنی ہمواری ہوتی ہے کہ وہ ہر اُس فرد یا گروہ کو جو برسرِ اقتدار ہو اسی قسم کے تاثرات دیتا ہے اور جونہی وہ اس سے محروم ہوتا ہے تو اُس کی ساری برائیاں دفعتاً اُس پر آشکارا ہو جاتی ہیں اور وہ "تخت نشینوں" کے ساتھ مل کر نئے فرش نشینوں کو کوستا ہے۔ خوشامدیوں کا یہ ٹولہ کسی کا وفادار نہیں ہوتا بلکہ ہر چڑھتے سورج کی پرستش کرتا ہے۔

اس طبقے کے علاوہ دوسرا گروہ جس کی خدمات سے اقتدار کے حریص نتائج سے یکسر بے پروا ہوکر فائدہ اٹھاتے ہیں وہ غنڈوں اور سماج دشمن عناصر پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ہر شریف معاشرے کے لیے عذاب ہوتے ہیں اور اپنی اخلاق سوز سرگرمیوں کی وجہ سے پوری سوسائٹی کو جہنم بنا دیتے ہیں۔ ملک میں اگر کوئی فرض شناس انتظامیہ کارفرما ہو تو ہر وقت انہی کی روک میں لگی رہتی ہے اور امن پسند شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو ان سے بچاتی ہے۔ کوئی معقول اور شریف انسان انہیں منہ نہیں لگاتا۔ البتہ جب کوئی گروہ دھونس اور دھاندلی کے ذریعہ اقتدار کے تخت کو حاصل کرنے کا تہیّہ کرلے اور اُس پر مدت دراز تک بالجبر قابض رہنے پر تُل جائے تو پھر وہ اسی بدکردار عنصر کو اپنے مقاصد کے لیے اچھی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کی مدد سے شریف لوگوں کو ڈرا دھمکا کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے اقتدار کی مخالف طاقتوں کو دبایا جاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے رائے عام کو غالب آنے سے روکا جاتا ہے، اسی کی وساطت سے اپنی بے پناہ طاقت و مقبولیت کے مصنوعی مظاہرے کیے جاتے ہیں، اور اسی ہتھیار کو آخر کار انتخابات جیتنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ عنصر اتنا بے وقوف تو نہیں ہوتا کہ دوسروں کا آلہ کار بن کر بس ان کی خدمت انجام دینے ہی پر اکتفا کر جائے۔ وہ اپنی اِن خدماتِ جلیلہ کے عوض لازمًا حکمراں طبقوں سے مختلف قسم کی مراعات حاصل کرتا ہے۔ حکمرانوں کو انہیں جرائم کی کھلی چھٹی دینی پڑتی ہے۔ وہ دیدہ دلیری کے ساتھ سمگلنگ کرتے ہیں، چوریاں کرتے ہیں، ڈاکے مارتے ہیں، اغوا کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں شریفوں کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالتے ہیں، اور ملک کی انتظامی مشینری اُن کے خلاف حرکت میں آنے سے عاجز رہتی ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ وہی لوگ جو انہیں اپنے عہدِ اقتدار میں مخالفوں کو ہراساں اور پریشان کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، تختِ اقتدار چھن جانے کے بعد خود ان کی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنتے ہیں لیکن اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔

(باقی ص ۱۴۴ پر)

تفہیم القرآن

سورۃ مومن

(۴)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو، اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے[۸۵]۔ وہی اللہ (جس نے تمہارے لیے یہ کچھ کیا ہے) تمہارا رب ہے۔ ہر چیز کا خالق۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں[۸۶]۔ پھر تم کدھر سے بہکائے جا رہے ہو؟[۸۷] اسی

---

۸۵ یہ آیت دو اہم مضامین پر مشتمل ہے۔ اولاً اس میں رات اور دن کو دلیلِ توحید کے طور پر پیش کیا گیا ہے، کیونکہ اُن کا باقاعدگی کے ساتھ آنا یہ معنی رکھتا ہے کہ زمین اور سورج پر ایک ہی خدا حکومت کر رہا ہے، اور ان کے اُلٹ پھیر کا انسان اور دوسری مخلوقاتِ ارضی کے لیے نافع ہونا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ وہی ایک خدا اِن سب اشیاء کا بھی خالق ہے اور اُس نے یہ نظام کمال درجہ حکمت کے ساتھ اِس طرح بنایا ہے کہ وہ اس کی پیدا کردہ مخلوقات کے لیے نافع ہو۔ ثانیاً، اُس میں خدا کے منکر اور خدا کے ساتھ شرک کرنے والے انسانوں کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ خدا نے رات اور دن کی شکل میں یہ کتنی بڑی نعمت اُن کو عطا کی ہے، اور وہ کتنے سخت ناشکرے ہیں کہ اُس کی اِس نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شب و روز اُس سے غداری و بے وفائی کیے چلے جاتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم، صفحات ۲۹۶ تا ۲۹۸۔ جلد سوم، صفحات ۴۶۱-۶۰۶-۶۵۹-۷۴۷۔ جلد چہارم، لقمان، آیت ۲۹، حاشیہ ۵۰۔ یٰس، آیت ۳۷، حاشیہ ۳۲)

۸۶ یعنی رات اور دن کے الٹ پھیر نے ثابت کیا کہ وہی تمہارا اور ہر چیز کا خالق ہے۔ اور

طرح وہ سب لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔[۸۸]
وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا[۸۹] اور اوپر آسمان کا
گنبد بنا دیا۔[۹۰] جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی۔ جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں
کا رزق دیا۔[۹۱] وہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بے حساب برکتوں والا ہے

یہ الٹ پھیر تمہاری زندگی کے لیے جو عظیم فوائد و منافع اپنے اندر رکھتا ہے اُس سے ثابت ہوا کہ وہ تمہارا نہایت مہربان پروردگار ہے۔ اس کے بعد لامحالہ یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ تمہارا حقیقی معبود بھی وہی ہے۔ یہ بات سراسر عقل اور انصاف کے خلاف ہے کہ خالق اور پروردگار تو ہو اللہ اور تمہارے معبود بن جائیں دوسرے۔

[۸۷] یعنی کون تم کو یہ الٹی پٹی پڑھا رہا ہے کہ جو نہ خالق ہیں نہ پروردگار وہ تمہاری عبادت کے مستحق ہیں۔

[۸۸] یعنی ہر زمانے میں عوام الناس صرف اس وجہ سے ان بہکانے والوں کے فریب میں آتے رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے حقیقت سمجھانے کے لیے جو آیات نازل کیں لوگوں نے ان کو نہ مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُن خود غرض فریبیوں کے جال میں پھنس گئے جو اپنی دوکان چمکانے کے لیے جعلی خداؤں کے آستانے بنائے بیٹھے تھے۔

[۸۹] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد سوم، صفحات ۵۹۰ تا ۵۹۲۔

[۹۰] یعنی تمہیں کھلی فضا میں نہیں چھوڑ دیا گیا کہ عالم بالا کی آفات بارش کی طرح برس کر تم کو تہس نہس کر دیں، بلکہ زمین کے اوپر ایک نہایت مستحکم سماوی نظام (جو دیکھنے والی آنکھ کو گنبد کی طرح نظر آتا ہے) تعمیر کر دیا جس سے گزر کر کوئی تباہ کن چیز تم تک نہیں پہنچ سکتی، حتیٰ کہ آفاق کی مہلک شعاعیں تک نہیں پہنچ سکتیں، اور اسی وجہ سے تم امن و چین کے ساتھ زمین پر جی رہے ہو۔

[۹۱] یعنی تمہارے پیدا کرنے سے پہلے تمہارے لیے اس قدر محفوظ اور پُرامن جائے قرار مہیا کی۔ پھر تمہیں پیدا کیا تو اس طرح کہ بہترین جسم، نہایت موزوں اعضاء اور نہایت اعلیٰ درجہ کی

وہ کائنات کا رب۔ وہی زندہ ہے[۹۲]۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے[۹۳]۔ ساری تعریف اللہ رب العٰلمین ہی کے لیے ہے[۹۴]۔

جسمانی و ذہنی قوتوں کے ساتھ تم کو عطا کیا۔ یہ سیدھا قامت، یہ ہاتھ اور یہ پاؤں، یہ آنکھ ناک اور یہ کان، یہ بولتی ہوئی زبان اور یہ بہترین صلاحیتوں کا مخزن دماغ تم خود بنا کر نہیں لے آئے تھے، نہ تمہاری ماں اور تمہارے باپ نے انہیں بنایا تھا نہ کسی نبی یا ولی یا دیوتا میں یہ قدرت تھی کہ انہیں بناتا۔ ان کا بنانے والا وہ حکیم و رحیم قادرِ مطلق تھا جس نے انسان کو وجود میں لانے کا جب فیصلہ کیا تو اسے دنیا میں کام کرنے کے لیے ایسا بے نظیر جسم دے کر پیدا کیا۔ پھر پیدا ہوتے ہی اس کی مہربانی سے تم نے اپنے لیے پاکیزہ رزق کا ایک وسیع خوانِ یغما بچھا ہوا پایا۔ کھانے اور پینے کا ایسا پاکیزہ سامان جو زہریلا نہیں بلکہ صحت بخش ہے، کڑوا کسیلا اور بدمزہ نہیں بلکہ خوش ذائقہ ہے، سڑا بُسا اور بدبودار نہیں بلکہ خوش رائحہ ہے، بے جان پھوک نہیں بلکہ اُن حیاتینوں اور مفید غذائی مادّوں سے مالا مال ہے جو تمہارے جسم کی پرورش اور نشوونما کے لیے موزوں ترین ہیں۔ یہ پانی، یہ غلے، یہ ترکاریاں، یہ پھل، یہ دُودھ، یہ شہد، یہ گوشت، یہ نمک مرچ اور مسالے جو تمہاری تغذیہ کے لیے اس قدر موزوں اور تمہیں زندگی کی طاقت ہی نہیں زندگی کا لطف دینے کے لیے بھی اس قدر مناسب ہیں، آخر کس نے اس زمین پر اتنی افراط کے ساتھ مہیا کیے ہیں، اور کس نے یہ انتظام کیا ہے کہ غذا کے یہ بے حساب خزانے زمین سے پے در پے نکلتے چلے آئیں اور ان کی رسد کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ پاتے؟ یہ رزق کا انتظام نہ ہوتا اور بس تم پیدا کر دیے جاتے تو سوچو کہ تمہاری زندگی کا کیا رنگ ہوتا۔ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ تمہارا پیدا کرنے والا محض خالق ہی نہیں بلکہ خالق حکیم اور ربِّ رحیم ہے؟

(مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم ص ۲۲۳-۲۲۴۔ جلد سوم، ص ۵۸۹ تا ۵۹۰)

۹۲۔ یعنی اصلی اور حقیقی زندگی اُسی کی ہے۔ اپنے بل پر آپ زندہ وہی ہے۔ ازلی و ابدی حیات اس کے سوا کسی کی بھی نہیں ہے۔ باقی سب کی حیات عطائی ہے، عارضی ہے، موت آشنا اور فنا در آغوش ہے۔

۹۳۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، الزُمر، حاشیہ ۳-۴۔

اَے نبی، اِن لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے تو اُن ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔[۹۵] (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جبکہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بیّنات آچکی ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں۔

وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمہیں بچّے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمہیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔[۹۶] یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقرر وقت تک پہنچ جاؤ،[۹۷] اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔[۹۸]

---

[۹۴] یعنی کوئی دوسرا نہیں ہے جس کی حمد و ثنا کے گیت گائے جائیں اور جس کے شکرانے بجا لائے جائیں۔

[۹۵] یہاں پھر عبادت اور دعا کو ہم معنی استعمال کیا گیا ہے۔

[۹۶] یعنی کوئی پیدا ہونے سے پہلے اور کوئی جوانی کو پہنچنے سے پہلے اور کوئی بڑھاپے کو پہنچنے سے پہلے مر جاتا ہے۔

[۹۷] وقتِ مقرر سے مراد یا تو موت کا وقت ہے، یا وہ وقت جب تمام انسانوں کو دوبارہ اٹھ کر اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو زندگی کے مختلف مرحلوں سے گزارتا ہوا اُس ساعتِ خاص تک لے جاتا ہے جو اُس نے ہر ایک کی واپسی کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اُس وقت سے پہلے ساری دنیا مل کر بھی کسی کو مارنا چاہے تو نہیں مار سکتی، اور وہ وقت آجانے کے بعد دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی کسی کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں تو کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے معنی لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ ہنگامۂ ہستی اس لیے برپا نہیں کیا گیا ہے کہ تم مر کر مٹی میں مل جاؤ اور فنا ہو جاؤ، بلکہ زندگی کے اِن مختلف مرحلوں سے اللہ تم کو اس لیے گزارتا ہے کہ تم سب اُس وقت پر، جو اُس نے مقرر کر رکھا ہے، اُس کے سامنے حاضر ہو۔

[۹۸] یعنی زندگی کے اِن مختلف مراحل سے تم کو اس لیے نہیں گزارا جاتا کہ تم جانوروں کی طرح جیو اور

وہی ہے زندگی دینے والا، اور وہی موت دینے والا ہے - وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے، بس ایک حکم دیتا ہے کہ ہو جائے، اور وہ ہو جاتی ہے ۷ۓ ع ۷

انہی کی طرح مر جاؤ، بلکہ اس لیے گزارا جاتا ہے کہ تم اُس عقل سے کام لو جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہے اور اُس نظام کو سمجھو جس میں خود تمہارے اپنے وجود پر یہ احوال گزرتے ہیں - زمین کے بے جان مادّوں میں زندگی جیسی عجیب و غریب چیز کا پیدا ہونا، پھر نطفے کے ایک خوردبینی کیڑے سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق کا وجود میں آنا، پھر ماں کے پیٹ میں استقرارِ حمل کے وقت سے وضعِ حمل تک اندر ہی اندر اُس کا اس طرح پرورش پانا کہ اُس کی جنس، اُس کی شکل و صورت، اس کے جسم کی ساخت، اس کے ذہن کی خصوصیات، اور اس کی قوتیں اور صلاحیتیں سب کچھ وہیں متعین ہو جائیں اور اُن کی تشکیل پر دنیا کی کوئی طاقت اثر انداز نہ ہو سکے، پھر یہ بات کہ جسے اسقاطِ حمل کا شکار ہونا ہے اس کا اسقاط ہی ہو کر رہتا ہے، جسے بچپن میں مرنا ہے وہ بچپن ہی میں مرتا ہے خواہ وہ امریکہ کے صدر ہی کا بچہ کیوں نہ ہو، اور جسے جوانی یا بڑھاپے کی کسی عمر تک پہنچنا ہے وہ خطرناک سے خطرناک حالات سے گزر کر بھی، جن میں بظاہر موت یقینی ہونی چاہیے، اُس عمر کو پہنچ کر رہتا ہے، اور جسے عمر کے جس خاص مرحلے میں مرنا ہے اُس میں وہ دنیا کے کسی بہترین ہسپتال کے اندر بہترین ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہتے ہوئے بھی مر کر رہتا ہے، یہ ساری باتیں کیا اس حقیقت کی نشان دہی نہیں کر رہی ہیں کہ ہماری اپنی حیات و ممات کا سر رشتہ کسی قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے؟ اور جب امرِ واقعہ یہی ہے کہ ایک قادرِ مطلق ہماری موت و زیست پر حکمراں ہے تو پھر کوئی نبی یا ولی یا فرشتہ یا ستارہ اور سیارہ آخر کیسے ہماری بندگی و عبادت کا مستحق ہو گیا؟ کسی بندے کو یہ مقام کب سے حاصل ہوا کہ ہم اس سے دعائیں مانگیں اور اپنی قسمت کے بننے اور بگڑنے کا مختار اُس کو مان لیں؟ اور کسی انسانی طاقت کا یہ منصب کیسے ہو گیا کہ ہم اس کے قانون اور اس کے امر و نہی اور اُس کے خود ساختہ حلال و حرام کی بے چون و چرا اطاعت کریں؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد سوم، ص ۲۰۳ - ۲۰۴ -)

تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں؟[۹۹] یہ لوگ جو اِس کتاب کو اور اُن ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسول کے ساتھ بھیجی تھیں؟[۱۰۰] عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردنوں میں ہونگے، اور زنجیریں، جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔[۱۰۱] پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ اب کہاں ہیں (اللہ کے سوا وہ دوسرے خدا) جن کو تم شریک کرتے تھے؟[۱۰۲] وہ جواب دینگے کھوئے گئے وہ ہم سے، بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے۔[۱۰۳] اِس طرح اللہ

---

۹۹ مطلب یہ ہے کہ اوپر والی تقریر کے بعد بھی کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ ان لوگوں کی غلط بینی اور غلط روی کا اصل سرچشمہ کہاں ہے اور کہاں سے ٹھوکر کھا کر یہ اس گمراہی کے گڑھے میں گرے ہیں؟ (واضح رہے کہ یہاں تم کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اِن آیات کو پڑھے یا سنے)۔

۱۰۰ یہ ہے اُن کے ٹھوکر کھانے کی اصل وجہ۔ اُن کا قرآن کو اور اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات کو نہ ماننا اور اللہ کی آیات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جھگڑالو پن سے اُن کا مقابلہ کرنا، یہی وہ بنیادی سبب ہے جس نے اُن کو بھٹکا دیا ہے اور اُن کے لیے سیدھی راہ پر آنے کے سارے امکانات ختم کر دیے ہیں۔

۱۰۱ یعنی جب وہ پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر پانی مانگیں گے تو دوزخ کے کارکن اُن کو زنجیروں سے کھینچتے ہوئے ایسے چشموں کی طرف لے جائیں گے جن سے کھولتا ہوا پانی نکل رہا ہو گا۔ اور پھر جب وہ اسے پی کر فارغ ہونگے تو پھر وہ انہیں کھینچتے ہوئے واپس لے جائیں گے اور دوزخ کی آگ میں جھونک دیں گے۔

۱۰۲ یعنی اگر وہ واقعی خدا یا خدائی میں شریک تھے، اور تم اِس امید پر اُن کی عبادت کرتے تھے کہ وہ بُرے وقت پر تمہارے کام آئیں گے تو اب کیوں وہ آکر تمہیں نہیں چھڑاتے؟

کافروں کا گمراہ ہونا متحقق کر دے گا۔ اُن سے کہا جائے گا "یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیرِ حق پر مگن تھے اور پھر اُس پر اِتراتے تھے[۱۰۹]۔ اب جاؤ، جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے، بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے متکبرین کا"۔ پس اے نبی، صبر کرو[۱۱۰]، اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ اب خواہ ہم تمہارے سامنے ہی اِن کو اُن بُرے نتائج کا کوئی حصّہ دکھا دیں جن سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں، یا اُس سے پہلے تمہیں دنیا سے اٹھا لیں، پلٹ کر آنا تو انہیں ہماری ہی طرف ہے[۱۱۱]۔

اے نبیؐ[۱۱۲]، تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات

---

[۱۰۸] یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم دنیا میں شرک نہیں کرتے تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اب ہم پر یہ بات کھل گئی ہے کہ ہم جنہیں دنیا میں پکارتے تھے وہ کچھ بھی نہ تھے، ہیچ تھے، لاشئے تھے۔

[۱۰۹] یعنی تم نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ جو چیز حق نہ تھی اُس کی تم نے پیروی کی، بلکہ تم اُس غیرِ حق پر ایسے مگن رہے کہ جب حق تمہارے سامنے پیش کیا گیا تو تم نے اُس کی طرف التفات نہ کیا اور اُلٹے اپنی باطل پرستی پر اِتراتے رہے۔

[۱۱۰] یعنی جو لوگ جھگڑالوپن سے تمہارا مقابلہ کر رہے ہیں اور ذلیل ہتھکنڈوں سے تمہیں نیچا دکھانا چاہتے ہیں اُن کی باتوں اور اُن کی حرکتوں پر صبر کرو۔

[۱۱۱] یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر اُس شخص کو جس نے تمہیں زک دینے کی کوشش کی ہے اسی دنیا میں اور تمہاری زندگی ہی میں سزا دے دیں۔ یہاں کوئی سزا پائے یا نہ پائے، بہر حال وہ ہماری گرفت سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ مر کر تو اسے ہمارے پاس ہی آنا ہے۔ اُس وقت وہ اپنے کرتوتوں کی بھرپور سزا پالے گا۔

[۱۱۲] یہاں سے ایک اور موضوع شروع ہو رہا ہے۔ کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ ہم آپ کو اُس وقت تک خدا کا رسول نہیں مان سکتے جب تک آپ ہمارا منہ مانگا معجزہ ہمیں نہ دکھا دیں۔ آگے کی آیات میں ان کی اِسی بات کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ جس قسم

ہم نے تم کو بتلائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔ کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آتا۔[۱۰۹] پھر جب اللہ کا حکم آگیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اُس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے۔[۱۱۰] ع اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی ۹ع
جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم اُن پر پہنچ سکو۔ اُن پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے، آخر تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے۔[۱۱۱]

سکے معجزات کا وہ لوگ مطالبہ کرتے تھے ان کے چند نمونوں کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحات ۳۲۷-۴۹۸-۶۴۲-۶۴۳-جلد سوم، ص ۴۴۵)۔

[۱۰۹] یعنی کسی نبی نے بھی کبھی اپنی مرضی سے کوئی معجزہ نہیں دکھایا ہے، اور نہ کوئی نبی خود معجزہ دکھانے پر قادر تھا۔ معجزہ تو جب بھی کسی نبی کے ذریعہ سے ظاہر ہوا ہے اُس وقت ظاہر ہوا ہے جب اللہ نے یہ چاہا کہ اس کے ہاتھ سے کوئی معجزہ کسی منکر قوم کو دکھایا جائے۔ یہ کفار کے مطالبے کا پہلا جواب ہے۔

[۱۱۰] یعنی معجزہ کبھی کھیل کے طور پر نہیں دکھایا گیا ہے۔ وہ تو ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اس کے ظاہر ہو جانے کے بعد جب کوئی قوم نہیں مانتی تو پھر اس کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ تم محض تماش بینی کے شوق میں معجزے کا مطالبہ کر رہے ہو، مگر تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس طرح دراصل تم خود تقاضے کر کر کے اپنی شامت بلا رہے ہو۔ یہ کفار کے اس مطالبے کا دوسرا جواب ہے، اور اس کی تفصیلات اس سے پہلے قرآن میں متعدد مقامات پر گزر چکی ہیں (ملاحظہ ہو جلد دوم، صفحات ۴۹۸-۵۱۰-۶۲۶-جلد سوم، ۱۴۸-۱۴۹-۴۴۵-۴۴۶-۴۹۸-۴۹۹)

[۱۱۱] مطلب یہ ہے کہ اگر تم محض تماشا دیکھنے اور دل بہلانے کے لیے معجزے کا مطالبہ نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمہیں صرف یہ اطمینان کرنے کی ضرورت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن باتوں کو ماننے کی دعوت تمہیں دے رہے ہیں (یعنی توحید اور آخرت)، وہ حق ہیں یا نہیں، تو اس کے لیے خدا کی یہ نشانیاں

بہت کافی ہیں جو ہر وقت تمہارے مشاہدے اور تجربے میں آ رہی ہیں۔ حقیقت کو سمجھنے کے لیے اِن نشانیوں کے ہوتے کسی اور نشانی کی کیا حاجت رہ جاتی ہے۔ یہ معجزات کے مطالبے کا تیسرا جواب ہے۔ یہ جواب بھی اس سے پہلے متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے اور ہم اس کی تشریح اچھی طرح کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو جلد اول صفحات ۷۵، ۵۲۴-۵۲۷۔ جلد دوم ۵۰۰، ۳۱۵-۷، ۴۴۴ تا ۴۴۹۔ جلد سوم ۷۷، ۴۷۷ تا ۴۷۹)۔

زمین پر جو جانور انسان کی خدمت کر رہے ہیں، خصوصاً گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ اور گھوڑے، اِن کو بنانے والے نے ایسے نقشے پر بنایا ہے کہ یہ بآسانی انسان کے پالتو خادم بن جاتے ہیں، اور اِن سے اُس کی بے شمار ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اِن پر سواری کرتا ہے۔ اِن سے باربرداری کا کام لیتا ہے۔ اِنہیں کھیتی باڑی کے کام میں استعمال کرتا ہے۔ اِن کا دودھ نکال کر اسے پیتا بھی ہے اور اس سے دہی، لسی، مکھن، گھی، کھویا، پنیر اور طرح طرح کی مٹھائیاں بناتا ہے۔ اِن کا گوشت کھاتا ہے۔ ان کی چربی استعمال کرتا ہے۔ ان کے اون اور بال اور کھال اور آنتیں اور ہڈی اور خون اور گوبر، ہر چیز اس کے کام آتی ہے۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے کہ انسان کے خالق نے زمین پر اُس کو پیدا کرنے سے بھی پہلے اُس کی ان بے شمار ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ جانور اِس خاص نقشے پر پیدا کر دیے تھے تاکہ وہ اُن سے فائدہ اٹھائے؟

پھر زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی سے لبریز ہے اور صرف ایک چوتھائی خشکی پر مشتمل ہے۔ خشک حصّوں کے بھی بہت سے چھوٹے اور بڑے رقبے ایسے ہیں جن کے درمیان پانی حائل ہے۔ کرۂ زمین کے اِن خشک علاقوں پر انسانی آبادیوں کا پھیلنا اور پھر اُن کے درمیان سفر و تجارت کے تعلقات کا قائم ہونا اِس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ پانی اور سمندروں اور ہواؤں کو ایسے قوانین کا پابند بنایا جاتا جن کی بدولت جہاز رانی کی جا سکتی، اور زمین پر وہ سروسامان پیدا کیا جاتا جسے استعمال کر کے انسان جہاز سازی پر قادر ہوتا۔ کیا یہ اس بات کی صریح علامت نہیں ہے کہ ایک ہی قادرِ مطلق ربِّ رحیم و حکیم ہے جس نے انسان اور زمین اور پانی اور سمندروں اور

پھر کیا^۱۱۱^ یہ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِن کو اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے تعداد میں زیادہ تھے، اِن سے بڑھ کر طاقتور تھے، اور زمین میں اِن سے زیادہ شاندار آثار چھوڑ گئے ہیں۔ جو کچھ کمائی اُنھوں نے کی تھی، آخر وہ اُن کے کس کام آئی؟ جب ان کے رسول ان کے پاس آئے تو وہ اُسی علم پر مگن رہے جو ان کے اپنے پاس تھا^۱۱۲^، اور پھر اُسی چیز کے پھیر میں آ گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو پکار اُٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہٗ لاشریک کو اور ہم انکار کرتے ہیں اُن سب معبودوں کا جنہیں ہم شریک ٹھیراتے تھے۔ مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان اُن کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے^۱۱۳^۔ اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے۔ ع ۹

ہواؤں اور اُن تمام چیزوں کو جو زمین پر ہیں اپنے خاص منصوبے کے مطابق بنایا ہے۔ بلکہ اگر انسان صرف جہاز رانی ہی کے نقطہ نظر سے دیکھے تو اس میں تاروں کے مواقع اور سیاروں کی باقاعدہ گردش سے جو مدد ملتی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ زمین ہی نہیں آسمانوں کا خالق بھی وہی ایک ربِّ کریم ہے۔

اِس کے بعد اس بات پر بھی غور کیجیے کہ جس خدائے حکیم نے اپنی اتنی بے شمار چیزیں انسان کے تصرف میں دی ہیں اور اُس کے مفاد کے لیے یہ کچھ سر و سامان کیا ہے، کیا بسلامتی ہوش و حواس آپ اس کے متعلق یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ معاذاللہ ایسا آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہوگا کہ وہ انسان کو یہ سب کچھ دے کر کبھی اس سے حساب نہ لے گا؟

۱۱۱۔ یہ خاتمہ کلام ہے۔ اِس حصے کو پڑھتے وقت آیات ۴، ۵ اور آیت ۲۱ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیں۔

۱۱۲۔ یعنی اپنے فلسفے اور سائنس، اپنے قانون، اپنے دنیوی علوم، اور اپنے پیشواؤں کے گھڑے ہوئے مذہبی افسانوں (MYTHOLOGY) اور دینیات (THEOLOGY) ہی کو انہوں نے اصل علم سمجھا اور انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے علم کو ہیچ سمجھ کر اُس کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔

۱۱۳۔ یہ کہ توبہ اور ایمان بس اسی وقت تک نافع ہیں جب تک آدمی اللہ کے عذاب یا موت کی گرفت میں نہ آ جائے۔ عذاب آ جانے یا موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد ایمان لانا یا توبہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے

حٰمٓ السجدہ

نام | اس سورۃ کا نام دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک حٰمٓ، دوسرے السجدہ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس کا آغاز حٰمٓ سے ہوتا ہے اور جس میں ایک مقام پر آیت سجدہ آئی ہے۔

زمانۂ نزول | معتبر روایات کی رو سے اس کا زمانۂ نزول حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے پہلے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق نے مشہور تابعی محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس موقع پر عُتبہ بن ربیعہ (ابوسفیان کے خسر) نے سردارانِ قریش سے کہا کہ صاحبو، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں، شاید کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور عُتبہ اُٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ آپ اُس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُس نے کہا: "بھتیجے، تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمہیں معلوم ہے۔ مگر تم اپنی قوم پر ایک بڑی مصیبت لے آئے ہو۔ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا۔ قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی بُرائی کی۔ اور ایسی باتیں کرنے لگے جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے

اب ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو۔ شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوالولید، آپ کہیں، میں سنوں گا۔ اس نے کہا "بھتیجے، یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے اس سے اگر تمہارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطبّاء بلواتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں"۔ عُتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا، ابوالولید آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟ اس نے کہا، ہاں۔ آپؐ نے فرمایا اچھا، اب میری سنو۔ اس کے بعد آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اسی سورۃ کی تلاوت شروع کی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیتِ سجدہ (آیت نمبر ۳۸) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا "اے ابوالولید، میرا جواب آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام"۔ عتبہ اٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دور سے اس کو دیکھتے ہی کہا، خدا کی قسم، عُتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے، یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آکر بیٹھا تو لوگوں نے کہا: کیا سن آئے؟ اس نے کہا "بخدا، میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم، نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے نہ کہانت۔ اے سردارانِ قریش، میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو، اگر عرب اس پر غالب آگئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور

دوسرے اُس سے نمٹ لیں گے لیکن اگر وہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی، اور اس کی عزت تمہاری عزت ہی ہوگی۔" سردارانِ قریش اُس کی یہ بات سنتے ہی بول اٹھے "ولید کے ابا. آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا"۔ عتبہ نے کہا، میری جو رائے تھی، وہ میں نے تمہیں بتا دی، اب تمہارا جو جی چاہے کرتے رہو (ابن ہشام، ج ا ص ۳۱۳-۳۱۴)۔

اس قصے کو متعدد دوسرے محدثین نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے، جن میں تھوڑا بہت لفظی اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضورؐ تلاوت کرتے ہوئے آیت فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ (اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں) پر پہنچے تو عتبہ نے بے اختیار آپ کے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور کہا "خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو"۔ بعد میں اس نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنے اِس فعل کی وجہ یہ بیان کی کہ "آپ لوگ جانتے ہیں، محمدؐ کی زبان سے جو بات نکلتی ہے پوری ہو کر رہتی ہے، اس لیے میں ڈر گیا کہ کہیں ہم پر عذاب نازل نہ ہو جائے"۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۹۰-۹۱۔ البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۶۲)۔

موضوع اور مضمون | عُتبہ کی اِس گفتگو کے جواب میں جو تقریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، اس میں اُن بیہودہ باتوں کی طرف سرے سے کوئی التفات نہ کیا گیا جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھیں۔ اس لیے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ دراصل حضورؐ کی نیت اور آپ کی عقل پر حملہ تھا۔ اُس کی ساری باتوں کے پیچھے یہ مفروضہ کام کر رہا تھا کہ حضورؐ کے نبی، اور قرآن کے وحی ہونے کا تو بہرحال کوئی

امکان نہیں ہے، اب لامحالہ آپؐ کی اِس دعوت کا محرک یا تو مال و دولت اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ہے، یا پھر، معاذ اللہ، آپؐ کی عقل میں فتور آگیا ہے۔ پہلی صورت میں وہ آپ سے سودے بازی کرنا چاہتا تھا، اور دوسری صورت میں یہ کہہ کر آپ کی توہین کر رہا تھا کہ ہم اپنے خرچ پر آپ کی دیوانگی کا علاج کرائے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی بیہودگیوں پر جب مخالفین اتر آئیں تو ایک شریف آدمی کا کام ان کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ اُن کو قطعی نظرانداز کر کے اپنی جو بات کہنی ہو کہے۔

عُتبہ کی باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اِس سورہ میں اُس مخالفت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جو قرآنِ مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے کفارِ مکہ کی طرف سے اُس وقت انتہائی ہٹ دھرمی اور بداخلاقی کے ساتھ کی جارہی تھی۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے، آپ خواہ کچھ کریں ہم آپ کی کوئی بات سُن کر نہ دینگے۔ ہم نے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں۔ اپنے کان بند کر لیے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک دیوار حائل ہوگئی ہے جو ہمیں اور آپ کو کبھی نہ ملنے دیگی۔

انہوں نے آپ کو صاف صاف نوٹس دے دیا تھا کہ آپ اپنی اِس دعوت کا کام جاری رکھیے، ہم آپ کی مخالفت میں جو کچھ ہم سے ہو سکے گا کرینگے۔

انہوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ جب بھی آپ یا آپ کے پیروؤں میں سے کوئی عام لوگوں کو قرآن سنانے کی کوشش کرے، فوراً ہنگامہ برپا کر دیا جائے اور اتنا شور مچایا جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔

وہ پوری سرگرمی کے ساتھ اِس کام میں لگے ہوئے تھے کہ قرآن مجید کی آیات کو اُلٹے معنی پہنا کر عوام میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائیں۔ بات کچھ کہی جاتی تھی اور وہ اسے بناتے کچھ تھے۔ سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالتے تھے۔ سیاق و سباق سے

الگ کر کے کوئی لفظ کہیں سے اور کوئی فقرہ کہیں سے لے اڑتے اور اس کے ساتھ اپنی طرف سے چار باتیں ملا کر نئے نئے مضامین پیدا کرتے تھے تاکہ قرآن اور اس کے پیش کرنے والے رسول کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کی جائے۔

عجیب عجیب قسم کے اعتراضات جڑتے تھے جن کا ایک نمونہ اس سورہ میں پیش کیا گیا ہے۔ کہتے تھے کہ ایک عرب اگر عربی زبان میں کوئی کلام سناتا ہے تو اس میں معجزے کی کیا بات ہوئی؟ عربی تو اس کی مادری زبان ہے۔ اپنی مادری زبان میں جس کا جی چاہے ایک کلام تصنیف کر لے اور دعویٰ کر دے کہ وہ اس پر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ معجزہ تو جب ہوتا کہ یہ شخص کسی دوسری زبان میں جسے یہ نہیں جانتا، یکایک اٹھ کر ایک فصیح و بلیغ تقریر کر ڈالتا۔ تب یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ اس کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ اوپر کہیں سے اس پر نازل ہو رہا ہے۔

اس اندھی اور بہری مخالفت کے جواب میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کا ماحصل یہ ہے:

(۱) یہ خدا ہی کا نازل کردہ کلام ہے اور عربی زبان ہی میں ہے۔ جو حقیقتیں اس میں صاف صاف کھول کر بیان کی گئی ہیں، جاہل لوگ اُن کے اندر علم کی کوئی روشنی نہیں پاتے، مگر سمجھ بوجھ رکھنے والے اس روشنی کو دیکھ بھی رہے ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے یہ کلام نازل کیا۔ کوئی اِسے زحمت سمجھتا ہے تو یہ اس کی اپنی بدنصیبی ہے۔ خوشخبری ہے اُن لوگوں کے لیے جو اس سے فائدہ اٹھائیں، اور ڈرنا چاہیے اُن لوگوں کو جو اس سے منہ موڑیں۔

(۲) تم نے اگر اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہیں تو نبی کے سپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ جو نہیں سننا چاہتا اسے سنائے

اور جو نہیں سمجھنا چاہتا اس کے دل میں زبردستی اپنی بات اُتار دے۔ وہ تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ سننے والوں ہی کو سنا سکتا ہے اور سمجھنے والوں ہی کو سمجھا سکتا ہے۔

(۳) تم چاہے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لو اور اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو، مگر حقیقت یہی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی ہے اور تم کسی دوسرے کے بندے نہیں ہو۔ تمہاری ضد سے یہ حقیقت بہر حال نہیں بدل سکتی۔ مان لوگے اور اس کے مطابق اپنا عمل درست کر لو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود ہی تباہی سے دوچار ہو گے۔

(۴) تمہیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ شرک اور کفر تم کس کے ساتھ کر رہے ہو؟ اُس خدا کے ساتھ جس نے یہ اتھاہ کائنات بنائی ہے، جو زمین و آسمان کا خالق ہے، جس کی پیدا کی ہوئی برکتوں سے اس زمین میں تم فائدہ اٹھا رہے ہو، اور جس کے مہیا کیے ہوئے رزق پر تم پل رہے ہو۔ اُس کا شریک تم اُس کی حقیر مخلوقات کو بناتے ہو، اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ضد میں آکر منہ موڑتے ہو۔

(۵) اچھا، نہیں مانتے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم پر اُسی طرح کا عذاب اچانک ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہے جیسا عاد اور ثمود پر آیا تھا۔ اور یہ عذاب بھی تمہارے جُرم کی آخری سزا نہ ہو گا، بلکہ آگے میدانِ حشر کی بازپرس اور جہنم کی آگ ہے۔

(۶) بڑا ہی بدقسمت ہے وہ انسان جس کے ساتھ ایسے شیاطینِ جن و انس لگ جاتیں جو اسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھاتے رہیں، اس کی حماقتوں کو اس کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کریں اور اسے کبھی نہ خود صحیح بات سوچنے دیں، نہ کسی دوسرے سے سننے دیں۔ اس طرح کے نادان لوگ آج تو یہاں ایک دوسرے کو بڑھاوے چڑھاوے دے رہے ہیں، اور ہر ایک دوسرے کی شہ پا کر

نیلے پر دہلا مار رہا ہے، مگر قیامت کے روز جب شامت آئے گی تو ان میں سے ہر ایک کہے گا کہ جن لوگوں نے مجھے بہکایا تھا وہ میرے ہاتھ لگ جائیں تو انہیں پاؤں تلے روند ڈالوں۔

(۷) یہ قرآن ایک اٹل کتاب ہے۔ اسے تم اپنی گھٹیا چالوں اور اپنے جھوٹ کے ہتھیاروں سے شکست نہیں دے سکتے۔ باطل خواہ سامنے سے آئے یا درپردہ اور بالواسطہ حملہ آور ہو، اسے زک دینے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔

(۸) آج تمہاری اپنی زبان میں یہ قرآن پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو تو تم کہتے ہو کہ یہ کسی عجمی زبان میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر ہم تمہاری ہدایت کے لیے عجمی زبان میں اسے بھیجتے تو تم ہی لوگ کہتے کہ یہ بھی عجیب مذاق ہے، عرب قوم کی ہدایت کے لیے عجمی زبان میں کلام فرمایا جا رہا ہے جسے یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں دراصل ہدایت مطلوب ہی نہیں ہے۔ نہ ماننے کے لیے نت نئے بہانے تراش رہے ہو۔

(۹) کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر فی الواقع حقیقت یہی نکلی کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے تو اس کا انکار کر کے اور اس کی مخالفت میں اتنی دُور تک جا کر تم کس انجام سے دوچار ہو گے۔

(۱۰) آج تم نہیں مان رہے ہو، مگر عنقریب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام آفاق پر چھا گئی ہے، اور تم خود اس سے مغلوب ہو چکے ہو۔ اس وقت تمہیں پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا تھا، وہ حق تھا۔

مخالفین کو یہ جوابات دینے کے ساتھ اُن مسائل کی طرف بھی توجہ فرمائی گئی ہے جو اس شدید مزاحمت کے ماحول میں اہلِ ایمان کو اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھے۔ ایمان لانے والوں کے لیے اُس وقت تبلیغ کرنا تو درکنار، ایمان کے راستے

پر قائم رہنا بھی سخت دشوار ہو رہا تھا، اور ہر اُس شخص کی جان عذاب میں آجاتی تھی جس کے متعلق یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ دشمنوں کی خوفناک جتھہ بندی اور ہر طرف چھائی ہوئی طاقت کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ اِس حالت میں اوّل تو یہ کہہ کر اُن کی ہمت بندھائی گئی کہ تم حقیقت میں بے یار و مددگار نہیں ہو، بلکہ جو شخص بھی ایک دفعہ خدا کو اپنا رب مان کر اِس عقیدے اور مسلک پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتا ہے، خدا کے فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں اور دنیا سے لے کر آخرت تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ پھر یہ فرما کر ان کا حوصلہ بڑھایا گیا کہ بہترین ہے وہ انسان جو خود نیک عمل کرے، دوسروں کو خدا کی طرف بلائے، اور ڈٹ کر کہے کہ مَیں مسلمان ہُوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو سوال سخت پریشان کُن بنا ہُوا تھا وہ یہ تھا کہ جب اِس دعوت کی راہ میں ایسے سنگِ گراں حائل ہیں تو اِن چٹانوں سے تبلیغ کا راستہ آخر کیسے نکالا جائے۔ اِس سوال کا حل آپ کو یہ بتایا گیا کہ یہ نمائشی چٹانیں بظاہر بڑی سخت نظر آتی ہیں، مگر اخلاقِ حسنہ کا ہتھیار وہ ہتھیار ہے جو انہیں توڑ کر اور پگھلا کر رکھ دے گا۔ صبر کے ساتھ اس سے کام لو، اور جب کبھی شیطان اشتعال دلا کر کسی دوسرے ہتھیار سے کام لینے پر اکسائے تو خدا سے پناہ مانگو۔

مزدور تحریکوں کے متعلق

جماعت اسلامی کی پالیسی

(ابوالاعلیٰ مودودی)

[پچھلے دنوں جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دینے اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کرنے کے لیے جو حیلے اور بہانے گھڑے گئے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یہ جماعت مزدوروں اور کارخانہ داروں کے درمیان نزاع و کشمکش برپا کرتی رہی ہے اور اس نے صنعتی اداروں میں ہنگامے برپا کرائے ہیں اور غیر قانونی ہڑتالیں کرائی ہیں یہ سراسر ایک جھوٹا الزام تھا جس کے ثبوت میں کوئی ایک مثال بھی کسی غیر قانونی ہڑتال یا کسی ہنگامے کی پیش نہیں کی جا سکتی۔ رہی مزدوروں کے معاملہ میں جماعت اسلامی کی پالیسی تو وہ تفصیل کے ساتھ مجلسِ شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان (منعقدہ اپریل ۱۹۵۱ء) کی ایک قرارداد میں بیان کی جا چکی ہے۔ اسی کی مزید تفصیل حسبِ ذیل تقریر میں بیان کی گئی ہے جو لیبر ویلفیئر کمیٹی پاکستان کی کنونشن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نے ۱۲ مئی ۱۹۵۰ء کو کی تھی۔ یہ تقریر اخبار نور، حیدر آباد مورخہ جولائی ۵۰ء سے یہاں نقل کی جا رہی ہے]

اس وقت صنعت کار جن مشکلات میں گرفتار اور جن مسائل سے دوچار ہیں ان کی اصل وجہ معاشی نظام کی خرابی ہے، اور خود معاشی نظام کی خرابیوں کا ذمہ دار وہ بگڑا ہوا نظامِ زندگی ہے جس کا یہ معاشی نظام محض ایک جز ہے۔ جب تک یہ پورا نظامِ زندگی نہیں بدلے گا اور اس کے نتیجہ میں معاشی نظام بہتر نہ ہوگا، محنت کش طبقہ کی موجودہ مشکلات کلی طور پر

رفع نہیں ہوسکتیں۔

اس وقت ہمارے ملک میں جو معاشی نظام رائج ہے وہ صرف انگریزی دورِ حکومت ہی کی یادگار نہیں ہے بلکہ انگریزوں سے بھی پہلے سے اس نظام کی خرابیاں واضح تھیں۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی لوگ چیخ رہے تھے اور ایک ظالمانہ معاشی نظام سے سخت نالاں و پریشان تھے۔ جب انگریز آئے تو انہوں نے اُس وقت کی موجود خرابیوں پر بے شمار نئی خرابیوں ،کا اضافہ کردیا اور پہلے سے کہیں بدتر نظام ملک پر مسلط کردیا۔

انگریزی دَور میں خرابیوں کے اضافے کی وجہ یہ تھی کہ اوّل تو وہ ایک خالص مادہ پرستانہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ دوسرے وہ اس سرمایہ دارانہ نظام کے عروج کا زمانہ تھا جس میں سرمایہ دار کو مکمل آزادی حاصل تھی اور اس پر کوئی قدغن نہ تھا۔ اس پر مزید یہ کہ انگریز اپنے ساتھ استعماری اغراض لے کر آئے تھے اور یہاں کے باشندوں کو لوٹ کر اپنے قومی مفاد کی خدمت کرنا ان کے پیشِ نظر تھا۔ ان تین چیزوں کی وجہ سے ان کا مسلط کردہ نظام ظلم کا مجموعہ بن گیا۔

اس کے بعد ہمیں ان کی غلامی سے تو نجات مل گئی مگر افسوسناک امر یہ ہے کہ اُن کے چلے جانے پر بھی یہاں کے معاشی نظام میں کسی تبدیلی کے آثار رونما نہ ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سیاسی انقلاب کسی اخلاقی اور فکری انقلاب کی جدوجہد کے نتیجے میں رونما نہیں ہوا بلکہ یہ ایک مصنوعی انقلاب تھا جو محض ایک سیاسی کشاکش کے نتیجہ میں رونما ہوگیا تھا۔ حصولِ آزادی سے ایک روز پہلے بھی کسی کے پاس آئندہ کے لیے کوئی نقشۂ کار نہیں تھا۔ کسی نظامِ زندگی کا واضح تصوّر موجود نہ تھا۔ ملّت کے سامنے کوئی پروگرام نہ تھا جسے لے کر چلنا مقصود ہوتا۔ آزادی ملنے کے بعد سے آج تک ہمارے ہاں کسی خرابی میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ انگریز نے سرمایہ داری، استعماریت اور مادہ پرستی کی بنیاد پر جو نظام قائم کیا تھا وہ آج بھی جوں کا توں قائم ہے۔ اسے بدلنے کے بجائے الٹی اس کو ترقی دی جارہی ہے

جو قوانین اس نظام کی حفاظت کے لیے بنائے گئے تھے، ان میں پاکستان بننے کے بعد کسی تبدیلی اور ترمیم کی ضرورت تک محسوس نہیں کی گئی۔ انگریزوں نے اپنی استعماری طاقت کے استحکام کے لیے جو ضوابط بنائے تھے وہ اسی طرح قائم ہیں۔ وہی انتظامی پالیسی کارفرما ہے اور وہی تعلیمی نظام رائج ہے۔

اگر ہماری آزادی کسی اخلاقی اور اصولی جدوجہد کا فطری نتیجہ ہوتی تو ہمارے سامنے اول روز سے کوئی نقشہ ہوتا جس پر اس ملک کو چلایا جاتا۔ یہ نقشہ بہت پہلے بنا لیا گیا ہوتا اور آزادی ملنے کے بعد ایک دن بھی ضائع کیے بغیر ہم ایک متعین راہ پر چل پڑتے لیکن ایسا نہیں ہوا آج ہمارے دورِ غلامی کی خرابیاں کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی ہیں۔ بلکہ انگریزی دور کی خرابیوں میں ہمارے ہاں اب بہت کچھ اضافہ ہو چکا ہے۔ اور ان کو نشو و نما نصیب ہو رہا ہے۔

اس وقت ہماری حقیقی ضرورت یہ ہے کہ سارا نظامِ زندگی تبدیل کیا جائے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا کوئی تکلیف، کوئی شکایت اور کوئی خرابی کلی طور پر رفع ہونی ممکن نہیں ہے۔ خرابیوں کا اصل علاج یہ ہے کہ سارا نظام اپنی نظریاتی اور اخلاقی بنیادوں کے ساتھ بدلا جائے اور اس کو دوسری اخلاقی و نظریاتی بنیادوں پر قائم کیا جائے جو اجتماعی انصاف کی ضامن ہوں۔ جب نظامِ زندگی بدلے گا تو عدل و انصاف خود قائم ہو جائے گا اور محنت پیشہ لوگوں کی مشکلات اور شکایات آپ سے آپ دور ہو جائیں گی۔

ہمارے نزدیک نظامِ زندگی کے لیے ایسی بنیادیں جو فی الواقع اجتماعی عدل کی ضامن ہو سکیں صرف اسلام ہی فراہم کر سکتا ہے اور اسی کے قیام کی ہم کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ آج کل بہت سے لوگ اسلامی انصاف کے مختلف تصورات پیش کر رہے ہیں۔ کسی کے نزدیک اس کی تعبیر کچھ ہے اور کسی کے نزدیک کچھ۔ لیکن یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ اسلام کے اصل مآخذ کتاب و سنت موجود ہیں۔ جو تعبیر بھی چل سکے گی بہر حال وہ وہی ہوگی جس کے لیے قرآن و سنت میں کوئی دلیل مل سکے۔ اور آخر کار مسلم معاشرے کی رائے عام ہی

یہ فیصلہ کرے گی کہ اسے کونسی تعبیر قبول ہے اور کونسی نہیں۔ اس لیے اختلافِ تعبیرات سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قرآن و سنت کی بنیاد پر جو نظامِ زندگی بھی قائم ہوگا، انشاء اللہ عدل و انصاف کا ضامن ہوگا۔

لیکن جب تک نظامِ زندگی میں یہ بنیادی تبدیلی نہ ہو، ہمیں کوشش کرنی ہے کہ جس حد تک بھی انصاف قائم ہوسکے کیا جائے، اور محنت کش لوگوں کی تکالیف و شکایات کو رفع کرانے کے لیے جو کچھ بھی کیا جا سکتا ہے اس میں دریغ نہ کیا جائے۔ لیبر ویلفیئر کمیٹی پاکستان اسی مقصد کے لیے کام کر رہی ہے۔ یہ ایک وقتی اور ضمنی کوشش ہے اور اُس وقت تک کے لیے ہے جب تک نظامِ زندگی کی تبدیلی میں ہمیں کامیابی نصیب نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ اس نئی مزدور تحریک کا ایک چھوٹا مقصد یہ بھی ہے کہ کوئی گروہ محنت کشوں کی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے سوا کسی دوسرے نظام کے لیے انہیں اپنا آلۂ کار نہ بنا سکے۔

اس دوسرے مقصد کی وضاحت میں اس طرح کروں گا کہ مختلف لوگوں کی نفسیات مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص تکلیف سے کراہ رہا ہے۔ ایک ذہن اسے دیکھ کر یہ سوچتا ہے کہ یہ وقت ہے اِس شخص کو لوٹ لینے کا، اس کی تکلیف اور بیماری سے فائدہ اٹھانے کا اور اس کی مصیبت کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کا۔ دوسرا شخص اس طرح سوچتا ہے کہ جب تک اس شخص کے مکمل علاج کا کوئی انتظام نہ ہوسکے اسے کسی نہ کسی طرح فرسٹ ایڈ بہم پہنچائی جائے، اور اس کی تکلیف میں جس حد تک ممکن ہو کمی کی جائے۔ محنت کش طبقہ کے معاملہ میں اس وقت یہ دونوں طرح کے نفسیات اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ یہ طبقہ اس وقت سخت مشکلات میں گرفتار ہے اور جدید سرمایہ دارانہ نظام نے اسے بے شمار تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایک گروہ چاہتا ہے کہ اس کی مشکلات کو سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرے۔ اس کا اصل مقصد ان مشکلات کو دُور کرنا اور ان شکایات کو رفع کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی کوشش یہ ہے کہ یہ اور بڑھیں، کوئی شکایت دُور ہوسکتی بھی ہو تو

اسے دُور نہ ہونے دیا جائے، کوئی زخم بھر سکتا ہو تو اسے اور زیادہ کھرچ دیا جائے، تاکہ اس طبقے کی بے چینی بڑھے اور اسے توڑ پھوڑ کے لیے، نظم و نسق تباہ کرنے کے لیے، اور بالآخر ایک اشتراکی نظام برپا کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ جس نظام کو یہ لوگ مزدور کی جنت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں درحقیقت وہ مزدور کی دوزخ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محنت کش طبقہ کی حقیقی شامت اُسی روز شروع ہوگی جس روز خدانخواستہ وہ نظام برپا ہو گیا۔ بلا شبہ آج مزدور کی حالت ناگفتہ بہ ہے لیکن ایک اشتراکی نظام میں اس کی جو حالت ہوگی اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آج آپ مطالبات کر سکتے ہیں، مطالبات نہ مانے جائیں تو سٹرائک کر سکتے ہیں، جلسے کر سکتے ہیں، جلوس نکال سکتے ہیں، شور مچا سکتے ہیں۔ ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ قسمت آزمائی کے لیے بھی جا سکتے ہیں۔ اشتراکی جنت میں ان سب چیزوں کا دروازہ بند ہوگا۔ وہاں مزدوروں کے لیے کسی تکلیف پر دم مارنے کی بھی گنجائش نہ ہوگی۔ جلسہ اور جلوس کیسا اور ہڑتال کا کیا ذکر؟

پھر اس کے لیے وہاں ایک در کے سوا کوئی دوسرا در بھی نہ ہوگا جس پر آدمی قسمت آزمائی کے لیے جا کھڑا ہو۔ سارے ملک میں ایک زمیندار ہوگا جس کی کاشتکاری خواستہ و ناخواستہ کرنی ہوگی۔ سارے ملک میں ایک کارخانہ دار ہوگا جس کے ہاں مزدوری کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ خواہ آپ کی گزر اوقات ہو سکے یا نہ ہو سکے، وہی کچھ آپ کو قبول کرنا ہوگا جو وہ عنایت کر دے۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے یہ گروہ محنت کش طبقے کو آلۂ کار بنانا چاہتا ہے، اور اس غرض کے لیے وہ اُن غریب لوگوں کے مسائل اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تاکہ ان کا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکے۔

ہماری نئی لیبر ویلفیئر تحریک اس کے برعکس ایک دوسرا مقصد اپنے سامنے رکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جب تک اجتماعی انصاف کا اسلامی نظام قائم نہ ہو، اِس مصیبت زدہ طبقے کی تکالیف کو جہاں تک بھی ممکن ہو رفع کرایا جائے اور اسے کسی سیاسی ایجی ٹیشن کے لیے آلۂ کار نہ خود بنایا جائے نہ کسی کو بنانے دیا جائے۔

ہم طبقاتی کشمکش کے قائل نہیں ہیں بلکہ دراصل ہم تو طبقاتی حس اور طبقاتی امتیاز کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ ایک معاشرے میں طبقے دراصل ایک غلط نظام سے پیدا ہوتے ہیں اخلاق کی خرابی ان میں امتیازات کو ابھارتی ہے۔ اور بے انصافی ان کے اندر طبقاتی حس پیدا کر دیتی ہے۔ اشتراکیت کا پروگرام یہ ہے کہ اس طبقاتی حس کو زیادہ سے زیادہ تیز کر کے ایک ہی معاشرے کے مختلف طبقوں کو لڑا دیا جائے اور سرمایہ داری و جاگیرداری کے ظالمانہ نظام کو درہم برہم کر کے اشتراکیت کا اس سے بھی زیادہ ظالمانہ نظام قائم کر دیا جائے۔ ہم اس کے برعکس انسانی معاشرے کو ایک تنِ واحد کے اعضا کی طرح سمجھتے ہیں۔ جس طرح ایک جسم میں مختلف اعضا ہوتے ہیں اور جسم کے اندر ان کا مقام اور ان کا کام جدا جدا ہوتا ہے، مگر ہاتھ کی پاؤں سے اور دماغ کی جگر سے کوئی لڑائی نہیں ہوتی، بلکہ جسم زندہ ہی اس طرح رہتا ہے کہ یہ سب اپنے اپنے مقام پر اپنا اپنا کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ معاشرے کے مختلف اجزا بھی اپنی اپنی جگہ اپنی قابلیت و صلاحیت اور فطری استعداد کے مطابق کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار اور مونس و غمخوار بنیں، اور ان کے اندر طبقاتی کشمکش تو درکنار طبقاتی حس اور طبقاتی امتیاز ہی پیدا نہ ہونے پائے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہر شخص خواہ وہ اجیر ہو یا مستاجر، اپنے حقوق سے پہلے اپنے فرائض کو پہچانے اور انہیں ادا کرنے کی فکر کرے۔ افراد میں جتنا جتنا احساس فرض بڑھتا جائے گا، کشمکش ختم ہوتی جائے گی اور مشکلات کی پیدائش کم ہوتی چلی جائے گی۔

ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کی اخلاقی حس بیدار کی جائے اور "اخلاقی انسان" کو اس "ظالم حیوان" کے چنگل سے چھڑایا جائے جو اس پر غالب آ گیا ہے۔ اگر افراد کے اندر کا یہ اخلاقی انسان اس غالب حیوانیت سے آزاد ہو کر ٹھیک کام کرنے لگے تو خرابیوں کا سرچشمہ ہی سوکھتا چلا جائے گا۔

لیبر ویلفیئر کمیٹی پاکستان جن اصولوں پر کام کر رہی ہے وہ یہ ہیں کہ اجیر اور مستاجر کی

ہر نزاع میں پہلے یہ دیکھا جائے کہ حق اور انصاف کا تقاضا کیا ہے۔ یہ کمیٹی آنکھیں بند کرکے نہ کسی کی حمایت کرتی ہے نہ مخالفت۔ وہ محنت کشوں کے صرف ان مطالبات کی تائید و حمایت کرتی ہے جو جائز، معقول اور منصفانہ ہوں۔

ایسے مطالبات کو منوانے کے لیے وہ سب سے پہلے مستاجر سے، خواہ وہ حکومت کا کوئی محکمہ ہو، یا کوئی کمپنی اور کارخانہ، یا کوئی پرائیویٹ شخص، براہِ راست گفت و شنید کرتی ہے اور اسے سمجھا کر حق مان لینے اور انصاف دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کا بطورِ خود انصاف کے لیے تیار ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ انہیں اس پر مجبور کیا جائے۔

اس میں ناکام ہونے کے بعد یہ کمیٹی محنت کشوں کو شور و غل اور ہنگامے اور ہڑتال کا راستہ دکھانے کے بجائے قانونی تدابیر سے ان کا حق دلوانے کی کوشش کرتی ہے۔ موجودہ قوانین میں زیادہ سے زیادہ جس حد تک بھی محنت کشوں کو انصاف دلوانے کی گنجائش ہے اور اس غرض کے لیے جو مشینری بھی اس وقت پائی جاتی ہے، یہ کمیٹی اس سے فائدہ اٹھانے اور حقداروں کے حق دلوانے کی پوری کوشش کرتی ہے۔

لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، جو نظام انگریزی دور میں قائم ہوا تھا وہ سرمایہ داری اور غیر ملکی استعمار کے مفاد کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس میں قوانین کا رجحان زیادہ تر محنت کرنے والوں کے بجائے محنت لینے والوں کی تائید میں تھا، اور اس میں نظم و نسق کی پالیسی بھی عملاً یہی رجحان رکھتی تھی۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد آنکھیں بند کر کے وہی قوانین بلا ترمیم و اصلاح برقرار رکھے گئے، اور نظم و نسق کے رجحانات میں بھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس لیے محنت کشوں کو انصاف دلوانے میں موجودہ قوانین کے نقائص بھی مشکلات پیدا کرتے ہیں، انصاف دلوانے کی مشینری بھی نہایت ناقص ہے، اور نظم و نسق بھی رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ لیبر ویلفیئر کمیٹی پاکستان اس امر کی پوری کوشش کر رہی ہے کہ آئینی جد و جہد کے ذریعے سے ان خامیوں کو رفع کرایا

جائے۔ محنت کشوں کے جائز اور منصفانہ حقوق قانون میں ٹھیک ٹھیک متعین کرائے جائیں۔ اجیر اور مستاجر کی نزاعات کا تصفیہ کرنے کے لیے باقاعدہ عدالتیں قائم کرائی جائیں، اور موجودہ عدالتی طریقِ کار کی ایسی اصلاح کرائی جائے کہ وہ بروقت انصاف حاصل کرنے میں مانع نہ ہو۔ اس کے ساتھ نظم و نسق کی پالیسی اس حد تک بدلوائی جائے کہ وہ معاشرے کے ایک محدود طبقے کی حمایت کرنے والی، اور سوادِ اعظم کے ساتھ بے دردی و سرد مہری برتنے والی نہ ہو۔

یہ ہے وہ مختصر پروگرام جس پر یہ نئی مزدور تحریک کام کر رہی ہے۔ میں اربابِ حکومت اور سرمایہ دار گروہ سے بھی کہتا ہوں کہ اپنی آنکھوں پر سے تعصبات کی پٹی کھول کر دیکھو کہ تمہاری اپنی بھلائی آیا اس میں ہے کہ محنت کش عوام کو طبقاتی جنگ کی آگ کا ایندھن بننے دیا جائے، یا اس میں کہ ہماری اس تحریک کے ذریعہ سے پُرامن اخلاقی اور آئینی تدابیر کو اجیر و مستاجر کے اختلافات میں کام کرنے کا موقع دیا جائے؟ اسی طرح میں محنت کش لوگوں سے بھی کہتا ہوں کہ تم عقل و خرد سے کام لو۔ تمہارے اصل مددگار وہ لوگ نہیں ہیں جو تمہاری شکایات رفع کرانے کے بجائے اپنی اغراض کے لیے اُن کو بڑھانے کے خواہاں ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو فی الواقع تمہاری ان شکایات کو رفع کرانا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ میں تمام اُن لوگوں سے بھی جو اس ملک کو طبقاتی کشمکش کا میدانِ جنگ اور بالآخر اشتراکی فساد کا لقمہ تر بنتے نہیں دیکھنا چاہتے اور یہاں اسلامی نظام کے بروئے کار آنے کی آرزو رکھتے ہیں، یہ کہتا ہوں کہ آپ پاکستان میں ہر جگہ اس نقشے پر کام کرنے والی لیبر ویلفیئر کمیٹیاں منظم کریں اور محنت کشوں کو ان کے ذریعہ سے انصاف حاصل کرنے کا راستہ دکھائیں۔

معرکہ حق و باطل

--- جناب ابن نذیر صاحب ایم۔ اے ---

"فہم قرآن کی ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے۔ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علمبرداران کفر و ضلالت سے اس کو لڑوا دیا گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی۔ اور داعیٔ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو اٹھایا اور حامیان حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فرد واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلہ پر اس نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب

اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آتے تھے۔ مکہ اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحد سے حنین و تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے۔ اور سابقین اولین سے لے کر "مولفۃ القلوب" تک سب ہی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم "سلوک" ہے جس کو میں "سلوک قرآنی" کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آکر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اُس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی و بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔"

(مقدمہ تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۳۳-۳۴ .

تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی حقیقت حق و باطل کی کشمکش ہے۔ اس زمین پر انسانی زندگی کے آغاز سے آج تک ایک صبح بھی ایسی نہیں گزری جب خیر و شر کی قوتیں باہم دست و گریباں نہ رہی ہوں اور کوئی شام ایسی نہیں آئی جس نے حق و باطل کے درمیان تعاون و مصالحت کا منظر دیکھا ہو۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

انسانی زندگی میں ہر قدم پر کشمکش، تصادم اور پیکار نظر آتی ہے۔ لیکن ظاہر بین نگاہیں

کبھی اسے محض قوتِ لایموت کے لیے جدوجہد کا نام دیتی ہیں اور کبھی اسے قوم، نسل اور طبقہ کی کشمکش کے رُوپ میں دیکھتی ہیں۔ کبھی اسے مفادات کی جنگ قرار دیتی ہیں اور کبھی تعصب و عصبیت کی پیکار ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ان میں سے ہر ایک، ایک مخصوص دائرہ میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ لیکن انسانی تاریخ کو صرف ان کے ذریعہ سمجھنے والا، اسباب و حقائق کے بجائے علامات و مظاہر پر نگاہیں مرکوز کر دینے کی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ سطح سمندر پر اُبھرنے والی لہریں تو دراصل اس تلاطم کا مظہر ہیں جو زیرِ آب طوفان بپا کیے ہوئے ہے۔ بدن پر رونما ہونے والے پھنسی پھوڑے تو اس فسادِ خون کی صرف علامات ہیں جو رگ و پے میں برپا ہے۔ بخار (TEMPERATURE) کا تعلق محض بدن کی جلد سے نہیں نظامِ جسم کے بگاڑ سے ہے، جس نے اس شکل میں اپنے کو ظاہر کیا ہے! ظاہر بین نگاہیں اس جزوی اور وقتی کشمکش ہی کو اصل کشمکش سمجھ لیتی ہیں جو مفادات کے تصادم اور طبقات کے ٹکراؤ میں نظر آتی ہے، حالانکہ انسانی زندگی کی اصل کشمکش حق و باطل، خیر و شر، نیکی و بدی، دعوتِ ربانی اور حزبِ طاغوت کی کشمکش ہے۔ باقی تمام کشمکشیں اسی عظیم تصادم کے اجزاء و فروع ہیں ــــ اس سے زیادہ کچھ نہیں!

اسلام کا طریقِ اصلاح | اسلام زندگی کے تمام اصولی اور جزوی مسائل کی اصلاح کرتا ہے لیکن وہ اصل و فرع اور کل و جز کو ان کے صحیح مقام پر رکھتا ہے۔ نہ ایک کو بڑھاتا ہے۔ اور نہ دوسرے کو کم کرتا ہے! پھر وہ محض علامتوں اور ظواہر پر تمام توجہ کو مرکوز کر دینے کے بجائے بنیادی حقائق اور اصل اسباب کو نمایاں کرتا ہے۔ وہ شاخوں سے لڑنے کے بجائے برائی کی جڑ پر تیشہ لگاتا ہے۔ وہ محض علامتوں کو نہیں اسباب کو دُور کرتا ہے ــــ وہ غیر متعلق یا کم تر اہمیت کے مسائل میں اُلجھ کر رہ جانے کے بجائے اساسی اور بنیادی معاملات کو درست کرتا ہے۔ اس طرح اسلام ایک طرف انسانی صلاحیت کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا ہے۔ اور دوسری طرف زندگی کے اصل بگاڑ کی اصلاح کر کے خدا کی زمین پر ایک ایسا صالح اور صحت مند نظام قائم کرتا ہے جو روئے زمین کو نیکیوں اور بھلائیوں سے بھر دیتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہدایت و ضلالت کا مسئلہ ہے اس کی نگاہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہو؟ وہ کس لیے جیے؟ زندگی کن اصولوں کے مطابق گزارے؟ تمدن کا نقشہ کس خاکہ کے مطابق بنائے؟ دوسروں سے تعلقات کی بنیاد کیا ہو؟ بالفاظِ دیگر اصل کامیابی اور فلاح کیا ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ وہ انسان کے لیے جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، وہ ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت۔ اس لیے ہر انسان سے دن میں بار بار وہ یہ کہلواتا ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم (یا اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھا) اور اسلام کی ساری تعلیمات، قرآن کی کل ہدایت اور حضرت آدم سے لے کر حضور اکرمؐ تک تمام انبیاء کی پوری زندگی اور دعوت اسی ایک سوال کا جواب اور اسی ایک دعا کی تکمیل ہے۔

قصۂ آدم و ابلیس | تخلیقِ آدمؑ کا جو قصہ قرآن نے بیان کیا ہے اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کی کشمکش کا ایک آئینہ ہے اور اس میں دو اہم کردار بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں جنھیں تاریخِ انسانی کی صورت گری کرنی ہے۔ ایک طرف انسانیت کا نمائندہ (حضرت آدمؑ) ہے جو علم الاشیاء حاصل کرتا ہے۔ تلمیذ الرحمٰن بنتا ہے۔ خالقِ حقیقی کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔ غلطی ہوتی ہے تو کانپ جاتا ہے۔ خود پسندی اور استکبار کے بجائے شرمندگی اور ندامت کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کا مطیع بنتا ہے۔ اور کامیاب ہوتا ہے۔

یہ ہے دعوتِ حق کا پہلا داعی اور ہدایتِ ربانی کا پہلا امین! دوسری طرف ابلیس ہے جو اپنے علم و صلاحیت کے باوجود نخوت، استکبار، حسد، اور فساد کا پیکر بننا پسند کرتا ہے۔ رب کے حکم سے رُوگردانی کرتا ہے۔ غلطی پر اصرار کرتا ہے۔ اور حق کی راہ کھوٹی کرنے اور خدا کے راستہ سے لوگوں کو ہٹانے کی روش اختیار کرتا ہے —— یہ ہے گمراہی کا پیکر اور ضلالت کا داعی —— ابلیس رجیم —— آدم و ابلیس کائناتِ ارضی کے دو کردار ہیں۔ ایک حق، صداقت، خیر و نور اور

دعوتِ اسلامی کا علم بردار ہے، اور دوسرا باطل. کذب، شر، ظلمت اور ضلالت کا ساتھ دونوں کے درمیان ابدی عداوت اور نہ ختم ہونے والی کشمکش ہے۔ اور یہی وہ کشمکش و پیکار ہے جس سے تاریخِ انسانی عبارت ہے۔ انسانوں کی ایک عظیم اکثریت خواہ محض خاموش تماشائی ہو لیکن قوموں کی قسمت کا فیصلہ بالآخر انہی فعّال انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے جو خواہ تعداد میں کم ہوں لیکن معرکۂ حق و باطل کے زندہ کردار ہوں، اور زندگی کو بنانے میں اپنا رول ادا کر رہے ہوں۔ پہلے دن سے انسانی سوسائٹی میں یہ کشمکش برپا رہی ہے اور رہے گی —— دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ اس معرکۂ حق و باطل میں وہ کس کا ساتھ دیتا ہے اور اس میں کیا خدمت سرانجام دیتا ہے۔

آدم و ابلیس کا پورا کردار جب واضح ہو کر سامنے آگیا تو ربّ السموات والارض نے صاف صاف کہہ دیا:

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔

(طٰہٰ - ۴ - ۱۲۳)

تم دونوں (فریق یعنی انسان اور شیطان) یہاں سے اُتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔ اور جو میرے ذکر (درسِ نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے

يَحْزَنُونَ - وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرہ - ۳۸ - ۳۹)

ان کے لیے کسی خوف و رنج کا موقع نہ ہوگا - اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے -

تاریخ کے دو کردار یعنی ہدایت الٰہی کے آجانے کے بعد ہی دو کردار ابھر ابھریں گے - ایک طرف حضرت آدمؑ کے متبع اور پیرو ہوں گے - جو دعوتِ حق کی اس شمع کو روشن رکھیں گے جو پہلے انسان اور نبی نے جلائی تھی - یہ وہ لوگ ہوں گے جو خدا کی ہدایت کو آگے بڑھ کر تھام لیں گے خدا کے نبی کی [illegible] گے [illegible] نحن انصار اللہ - دینِ حق کو اپنی زندگیوں پر قائم کریں گے - اور زندگی کے [illegible] نظام [illegible] رنگ میں رنگنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں گے - وہ حق کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال نہ دیں گے بلکہ حق کی آواز کانوں کے راستے داخل ہو کر ان کے دل و دماغ میں گھر کرے گی - [illegible] گی [illegible] وجود میں سما جائے گی - ان کی زندگیوں کی قلبِ ماہیت کر دے گی - ان کے سوچنے کے انداز، ان کے رہنے کے طریقے، ان کے اخلاق کے پیمانے، ان کی زندگی کے سانچے بدل دے گی - ان میں [illegible] نئے انسان کو پیدا کرے گی جو خدا کا مطیع اور اس کے دین کو غالب و قائم کرنے والا ہوگا - جو باطل سے کٹ کر حق سے جڑ جائے گا - اور غلبۂ حق کی جدوجہد میں مصروفِ کار ہوگا - اپنی ساری قوت - اپنے تمام سرمایۂ حیات کو حق کی شہادت میں صرف کر دے گا اور اس کی شہادت دیتا ہوا اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے گا یہ ہوگا آدمؑ کا اصلی کردار جو حزب اللہ کی زندگیوں میں اُبھرے گا -

ہدایتِ ربانی کے آجانے کے بعد ایک دوسرا کردار بھی نمایاں ہوگا —— یہ وہ لوگ ہوں گے جو حضرت آدمؑ اور اسوۂ انبیاء علیہم السلام کی پیروی کرنے کے بجائے ابلیس کے نقشِ قدم پر چلیں گے - یہ وہ لوگ ہونگے جو دعوتِ انبیاء کا ساتھ دینے یا اسے برداشت اور گوارا کرنے کے بجائے کھل کر اس کی مخالفت کو اپنا شیوہ بنائیں گے - اطاعتِ رب کے بجائے استکبار کی روش

اختیار کریں گے۔ یہ گروہ خدا کی ہدایت کو قبول کرنے میں اپنے مفادات کی موت سمجھے گا۔ اس میں اسے اپنے اقتدار اور اپنی چودھراہٹ کا خاتمہ ہوتا نظر آئے گا۔ وہ دعوتِ حق کا مذاق اڑائے گا۔ داعیانِ حق کا راستہ روکے گا۔ طنز و استہزاء اور تمسخر و بہتان طرازی سے کام لے گا۔ دعوتِ حق اگر قوت پکڑے گی تو اس کے دل کا چین اڑ جائے گا اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جائے گی۔ جب طنز و استہزاء کے حربے کامیاب ہوتے نظر نہ آئیں گے تو جھوٹے پروپیگنڈے اور عملی مزاحمت کا آغاز کرے گا۔ جسمانی اذیتیں دے گا۔ طوق و سلاسل کے پھندے ڈالے گا۔ قید و بند کی صعوبتیں دے گا۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم کرے گا۔ اور تیغ و سناں کی خون آشامی پر اتر آئے گا۔ غرض حق کا راستہ روکنے کے لیے ہر حربہ اور ہر ہتھیار استعمال کرے گا — یہ مخالفت کسی غیر انسانی مخلوق کی طرف سے نہیں، انسانوں کی طرف سے ہو گی۔ اپنے ہی اہلِ قوم اس میں پیش پیش ہوں گے۔ اس میں غیر ہی نہیں "اپنے" بھی ہوں گے۔ یہ صرف کفار ہی کی طرف سے نہیں بلکہ ان کی طرف سے بھی ہو گی جو اپنے کو خدا کا ماننے والا کہتے ہیں۔ باطل کے پرستار ہر طبقہ اور ہر گروہ سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ حق کا راستہ روکنے کے لیے مصروفِ کار ہو جائیں گے۔

یہ ہے قصۂ آدم کا دوسرا کردار جو انسانی معاشرہ میں ان سرکش مخالفینِ حق کی شکل میں ابھریگا۔ جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی دعوتِ حق کا عملاً راستہ روکیں گے۔ اور خدا کے بندوں کو گمراہی کی طرف لے جانے کی سعی و جہد کریں گے۔

حق و باطل کی یہ کشمکش فطرت کا قانون اور خدا کی سنت ہے۔ تخلیقِ آدم ہی کے وقت خود رب العزۃ نے آدم و ابلیس کے بارے میں بعضکم لبعض عدو (تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے) کے الفاظ میں فرما کر پورے علمِ انسانی کو اس سے متنبہ فرما دیا تھا۔ اور پھر شیطان نے تو کھلے چیلنج سے اس اشارہ کے سارے پہلوؤں کو بالکل صاف اور واضح کر دیا تھا۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ بولا: بس تو جیسا تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے

من خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم ولا تجد اکثرھم شاکرین۔ (الاعراف - ۱۷)

میں بھی تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں لگا رہوں گا۔ آگے اور پیچھے دائیں اور بائیں ہر طرف سے ان کو گھیروں گا۔ اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔

یہ وہ چیلنج تھا جو زمین پر انسانی زندگی کے آغاز ہی میں شیطان نے دے دیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کر لیا تھا کہ "ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں ان پر قابو چلنا مشکل ہے" (الحجر ۴۰)؛ اور رب حقیقی نے بھی یہ فرما کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مخلصین کو ابلیس کی شر انگیزیوں کے خلاف ضمانت اور پناہ دے دی تھی کہ "جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تجھے کچھ بھی قدرت نہیں ہے" (الحجر ۴۲)

صبح تمدن ہی سے خدا کے مخلصین اور شیطان کے متبعین کے درمیان کشمکش و پیکار برپا ہے۔ اور کسی دور اور کسی زمانہ میں بھی اس کشمکش کی شدت کم نہیں ہوتی۔ حزب اللہ کے قائد انبیاء اور رسول (علیہم السلام) رہے ہیں۔ حضرت آدم سے لے کر ختم الرسل حضرت محمد مصطفیٰؐ تک دعوتِ اسلامی کی رہنمائی و رہبری خدا کے یہی فرستادہ اور منتخب مخلصین کرتے رہے ہیں اور شیطان ہر دور میں نئے نئے طریقوں سے انسانوں ہی کے ذریعہ ان کا راستہ روکنا اور ان کی دعوت کو زک پہنچانے اور ناکام بنانے کی کارروائیاں کرتا رہا ہے۔ یہی سنتِ الٰہی ہے جس کی طرف اس آیتِ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (الانعام - ۱۱۲)

اور ہم نے تو اس طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے رہتے ہیں۔

دعوتِ انبیاء اور اس کا ردِ عمل | دعوتِ اسلامی کی پوری تاریخ انبیاءِ الٰہی اور متبعینِ شیطان،

داعیانِ حق اور پرستارانِ باطل، علم بردارانِ خیر و فلاح اور کارپردازانِ شر و فساد کے درمیان کشمکش اور جنگ و جدال کی داستان ہے۔ حق و باطل کا یہ معرکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا لازمی اور فطری تقاضا ہے۔ شیطان یہ کب برداشت کر سکتا ہے کہ خدا کے بندے صرف خدا کی پرستش کریں اور طاغوت سے اپنے تمام رشتوں کو کاٹ کر صرف اپنے رب اور خالق سے جڑ جائیں۔ ادھر یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ (اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے) کی پکار بلند ہوئی اور ادھر باطل کے ایوانوں میں کھلبلی مچی۔ ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اربابِ مفاد کو اپنا انجام نظر آنا شروع ہو جاتا ہے خود غرض عناصر بلبلا اٹھتے ہیں۔ مذہبی پروہت، معاشی اجارہ دار، سیاسی حکمراں سب مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ نظام جاہلیت کے سارے کارپرداز اس الارم کے بجتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور تحریکِ اسلامی کی مخالفت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی لالچ دے کر حق کے داعیوں کو خریدنا چاہتے ہیں اور کبھی دھمکیاں دے کر ان کو خائف و خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جس دل میں حق گھر کر جائے وہ ان باتوں کی فکر کب کرتا ہے۔ وہ تو برملا کہتا ہے کہ اگر میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیا جائے تب بھی اس دعوت اور اس مشن سے سرِ مُو نہ ہٹوں گا ـــــ اور اگر مجھے آروں سے کاٹ دیا جائے اور لوہے کی کنگھیوں سے میرا گوشت نوچ ڈالا جائے تب بھی اس پیغام اور اس تحریک سے غداری نہ کروں گا۔

<u>مخالفت کی شکلیں اور اعتراضات</u>: باطل کی قوتیں چونکہ حق کا مقابلہ دلیل و برہان کی قوت سے نہیں کر سکتیں اس لیے وہ تمسخر و استہزاء، تخفیف و تذلیل، جھوٹ و افترا، ظلم و زیادتی، قید و بند، کشت و خون اور قتل و غارت گری کے اوچھے ہتھیار استعمال کرتی ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں۔ دیکھیے ان کا سلوک انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جو انسانیت کے گلِ سرسبد اور دنیائے تہذیب کے سب سے بڑے محسن تھے، کیا رہا ہے۔

حضرت نوحؑ اپنے رب کے سامنے اپنی داستان اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ... رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا۔

نوح - ۲۲-۲۱- ۲۷

اے پروردگار میں اپنی قوم کو رات دن بلاتا رہا لیکن میرے بلانے سے وہ اور زیادہ گریز کرتے رہے۔ جب جب میں نے ان کو بلایا کہ (توبہ کریں اور) تو ان کو معاف فرمائے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور کپڑے لپیٹ لیے اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے .... میرے پروردگار! یہ لوگ میرے کہنے پر نہ چلے اور ان لوگوں کے تابع ہوئے جن کو ان کے مال اور اولاد نے بجز نقصان کے کوئی فائدہ نہ پہنچایا اور (میری مخالفت میں) وہ بڑی بڑی چالیں چلے۔

"احمق" اور "جھوٹا" حضرت ہود علیہ السلام نے جب خدا کی بندگی کی طرف بلایا تو صاحبِ اقتدار طبقہ نے ان کا مذاق اڑایا اور کہا:-

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ۔ (الاعراف ۶۶)

اور ان کی قوم کے سردار جو حق کے منکر تھے کہنے لگے تم تو ہمیں احمق نظر آتے ہو اور ہم تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

نکالو اس پاک باز کو حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو فحش اور بداخلاقی سے روکا اور اس خبیث شیطانی "فعل" پر ملامت کی جس کے وہ عادی تھے تو ان بدبخت مخالفین حق نے داعیانِ خیر و صلاح کے بارے میں طے کیا کہ:-

اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْیَتِكُمْ اِنَّهُمْ

ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ

اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ۔ (الاعراف-۸۲) پاک باز بنے پھرتے ہیں۔

حضرت شعیبؑ کی قوم پہلے سے مسلمان تھی۔ لیکن جب ان "بگڑے ہوئے مسلمانوں" کو نبی برحق نے ان کی گمراہیوں پر تنبیہ کی اور ان سے شریعتِ اسلامی کو قبول کرنے اور نافذ کرنے کے لیے کہا تو ان کا جواب بھی وہی تھا:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ ... لَنُخْرِجَنَّکَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَکَ ... مِنْ قَرْیَتِنَآ۔ (الاعراف-۸۸)

ان کی قوم میں جو لوگ سردار اور بڑے آدمی تھے وہ کہنے لگے کہ شعیبؑ! ہم تم کو اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لاتے ہیں ان کو اپنے شہر سے نکال دیں گے۔

پرستارانِ باطل اہلِ حق کو ہمیشہ ہی بستیوں سے نکالنے، شہر بدر کرنے اور جلا وطن کرنے کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں۔ بلکہ اس روش پر عملاً کاربند بھی رہے ہیں۔

خطرہ ہے سخت خطرہ فرعون حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو سن کر ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ انہیں قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ اور اس کے اہلِ دربار یہ فرسودہ الزام لگاتے ہیں۔

اِنْ ھٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیْدٰنِ اَنْ یُّخْرِجٰکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِھِمَا وَ یَذْھَبَا بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی۔ (طٰہٰ-۶۳)

یہ دونوں (یعنی حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ) تو محض جادوگر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے (یعنی منصبِ اقتدار سے) بے دخل کر دیں۔ اور تمہارے مثالی طریقِ زندگی کا خاتمہ کر دیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں "جھوٹ، حماقت، جادوگری، دھوکہ دہی، ہوسِ اقتدار، طرزِ زندگی کو خطرہ، ساری تمدنی اور ثقافتی ترقی کی تباہی و بربادی" یہ وہ پٹے ہوئے الزام ہیں جو داعیانِ حق پر ہمیشہ چسپاں کیے جاتے رہے ہیں۔ مخالفین حق ہمیشہ ہی سے تنگ نظر اور بدنحو رہے ہیں۔ وہ اپنے اوہام اور اپنے اقتدار کی مخالفت گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ مخالفین خواہ کھلے کھلے کافر ہوں یا زبان

سے خدا کے وجود کا انکار کرنے والے ــــ اپنے مفاد کے مقابلہ میں حق کی راہ روکنے میں دونوں کا رویہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ اور تاریخ میں ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں جب مخالفتِ حق میں یہ نام نہاد خدا پرست کھلے کافروں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے جو اپنے اندر عبرت اور موعظت کے بے شمار پہلو لیے ہوئے ہے۔ خدا نے اس قوم پر کیا کیا فضل و انعام نہ کیے لیکن ان گمراہ انسانوں کا رویہ کیا تھا۔

بنی اسرائیل کی داستانِ خوں چکاں | بنی اسرائیل خود ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے درپے تھے اور ان کا ایک گروہ اپنے بھائیوں کو مٹانے کے لیے غیروں سے (یعنی دمشق کی آرامی سلطنت سے) مدد مانگتا ہے۔ حنانی نبی نے اس پر سخت تنبیہ کی لیکن سلطنتِ یہودیہ کے فرماں روا آسا نے خدا کے پیغمبر کی تنبیہ قبول کرنے کی بجائے اسے جیل بھیج دیا۔ (۲۔ تواریخ۔ باب ۱۶۔ آیت ۷۔ ۱۰)

حضرت الیاسؑ (ایلیا ELIJAH) نے جب یہودیوں کو توحید کی دعوت دی تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ انہیں جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ حضرت الیاس نے اس موقعہ پر جو دعا مانگی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا . . . تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔"

(۱۔ سلاطین۔ باب ۱۹۔ آیت ۲۶۔ ۲۷)

"اس بادشاہ اخی نے ایک اور نبی حضرت میکایاہؑ کو حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا۔ اور حکم دیا کہ "اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔"

(۱۔ سلاطین۔ باب ۱۹۔ آیت ۲۶۔ ۲۷)

حضرت زکریا نے جب شرک اور بدکاری و فحاشی کے خلاف آواز اٹھائی تو یوآس بادشاہ کے حکم سے انہیں سنگسار کیا گیا۔ (۲۔ تواریخ۔ باب ۲۴۔ آیت ۲۱۔ ۲۰)

جب بخت نصر نے بیت المقدس فتح کیا تو وہ ہیکل سلیمانی کی سیر کرنے لگا عین قربان گاہ کے سامنے ایک جگہ دیوار پر اسے ایک تیر کا نشان نظر آیا" اس نے یہودیوں سے پوچھا کہ یہ کیسا نشان ہے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہاں ذکریا نبی کو ہم نے قتل کیا تھا۔ وہ ہماری برائیوں پر ہمیں ملامت کرتا تھا۔ آخر جب ہم اس کی ملامت سے تنگ آگئے تو ہم نے اسے مار ڈالا۔"

یہودیوں کی دو حکومتیں تھیں۔ سامریہ کی دولت اسرائیلی اور یروشلم کی دولت یہودیہ۔ سامریہ کی اسرائیلی ریاست آشوریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی تو یروشلم کی یہودی ریاست کو تباہی سے بچانے کے لیے یرمیاہ نبی نے تحریک اصلاح برپا کی۔ وہ اپنی قوم کے زوال پر ماتم کرنے اٹھے اور گلی گلی اور کوچہ کوچہ انہوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا۔ مگر اس "سیاسی" کام پر ارباب اقتدار ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان پر لعنت دھتکار کی بارش ہوئی۔ پیٹے گئے، قید کیے گئے۔ رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیئے گئے تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں سوکھ کر مر جائیں۔ اور ان پر الزام لگایا گیا کہ قوم میں بد دلی و مایوسی پھیلاتے ہیں۔ انتشار برپا کرتے ہیں۔ قوم کے غدار ہیں۔ بیرونی دشمنوں سے ملے ہوتے ہیں ——— لہٰذا انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ (یرمیاہ۔ باب ۱۵۔ آیت ۱۰ باب ۱۸ آیت ۲۲-۲۰۔ باب ۲۰ آیت ۱۸-۱، باب ۲۶ تا باب ۴۰)

ایک اور نبی حضرت عاموسؑ نے جب سامریہ کی اسرائیلی حکومت کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان کی حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انہیں نوٹس دیا گیا کہ "ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو۔" (عاموس باب ۷، آیت ۱۰-۱۳)

حضرت یحییٰ (یوحنا) کو قوم کا نیک اور متقی ترین انسان سمجھا جاتا تھا اور اپنے پرائے سب اس کے معترف تھے لیکن جب اس مقدس انسان نے یہودیہ کے فرمانروا ہیرو ڈیس کے دربار میں کھلم کھلا ہونے والی بد اخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی تو اظہار حق کو "تخریبی تنقید" قرار دیا گیا۔ پہلے آپ کو قید کیا گیا۔ اور پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین انسان کا سر قلم کر کے

ایک تھال میں رکھ کر اس بدکردار عورت کی نذر کیا۔ (مرقس۔باب ۶۔آیت ۱۷۔۲۹) —

حضرت عیسیٰ نے جب بنی اسرائیل کے علماء، مفاد پرست عناصر اور سرداران قوم پر تنقید کی اور حق کا اظہار و اعلان کیا تو سب کا غصہ بھڑک اٹھا۔ ان کا "جرم" یہ تھا کہ وہ انہیں ان کے گناہوں ریاکاریوں اور ظلم و زیادتی پر ٹوکتے تھے اور ایمان و راستی کی تلقین کرتے تھے۔ اس قصور پر ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا۔ رومی عدالت سے ان کے قتل کا "فیصلہ" حاصل کیا گیا۔ اور جب رومی حاکم پیلاطس نے ان سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوعؑ اور برآباؔ ڈاکو میں سے کسی ایک کو رہا کرسکتا ہوں۔ کہو ان دونوں میں سے کس کو رہا کروں؟ تو ان سب نے بالاتفاق کہا — "برآبا ڈاکو کو چھوڑ دے۔ اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا" یہ اور بات ہے کہ خدا نے کچھ اور ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ ورنہ انھوں نے تو اپنے خیال میں حضرت عیسیٰ کو پھانسی پر لٹکا دیا!۔

~~بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد~~ یہ ہیں حق و باطل کی کشمکش کی صرف چند جھلکیاں۔ یہ داستان صرف ماضی کی ہی کہانی نہیں، حال کی رُوداد اور مستقبل کی تصویر بھی ہے۔ حق و باطل کی یہ کشمکش ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ داعیانِ حق کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا؟ لیکن ان کی کیفیت ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ؎ چو مرگ آید تبسم بر لب اوست۔

کوئی زمانہ اور کوئی دَور ایسا نہیں رہا جب حق کے نام لیوا اور اس کے داعی نہ رہے ہوں جب انبیاء کا مشن زندہ نہ رہا ہو۔ اور داعیانِ حق نے سچائی، نیکی اور حاکمیت الٰہی کی دعوت نہ دی ہو۔ مخالفتیں ان کی ہمتوں کو پست نہیں کرتیں، ان کے عزائم کو اور پختہ کر دیتی ہیں۔ بڑی سے بڑی مزاحمت، شدید سے شدید مظالم، سخت سے سخت استبداد ان کے پائے ثبات میں ذرا سی لغزش بھی پیدا نہیں کر پاتا ہے ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

دعوتِ انبیاء کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ کوئی چیز ان کو خائف نہیں کر پائی ہے جو

قدم خدا کی راہ میں اٹھتا ہے اسے کاٹا تو جا سکتا واپس نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور چشمِ تاریخ نے بالعموم یہی منظر دیکھا ہے کہ داعیانِ حق مخالفتوں کے طوفان کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاتے ہیں۔ جو دل ایک مرتبہ کلمۂ حق کا مسکن بن جاتا ہے وہ پھر مخالفین کی کسی ترغیب و ترہیب سے متاثر نہیں ہوتا۔

ثبات و عزیمت | پھر ثبات و عزیمت کا یہ مظاہرہ صرف انبیاء ہی نہیں کرتے بلکہ خدا دعوتِ انبیاء کے تمام مخلص علم برداروں کو صبر و استقامت کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ساحرانِ مصر کے کردار میں ہے۔ کجا تو وہ فرعون سے انعام پانے کے لالچ میں حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے آتے ہیں اور بڑے زعم سے چیلنج دیتے ہیں "موسیٰ تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں"۔ اور جب جادو بے اثر ہو گیا، حق ظاہر ہو گیا، تو نظامِ باطل کے وہی کارپرداز یک سر بدل جاتے ہیں۔ وہ جادوگر اب خدا پر ایمان لے آتے ہیں، سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور فرعون کے ہر عتاب کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہیں:۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى۔ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰي مَا جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللّٰهُ

فرعون نے کہا: تم ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا گرو ہے۔ جس نے تمہیں جادوگری سکھائی تھی۔ اچھا! اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں میں تمہیں سولی دیتا ہوں۔ پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے" (یعنی میں تمہیں سخت سزا دے سکتا ہوں یا موسیٰ)"۔ جادوگروں نے جواب دیا ــ "قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن

خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ۔ (طٰہٰ ۔ ۷۱-۷۳)

نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی حق و صداقت پر تجھے ترجیح دیں۔ محض اس لیے کہ تو برسرِ اقتدار ہے۔ تو جو کچھ کرنا چاہے کرلے۔ تو زیادہ سے زیادہ اس دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے۔ اللہ ہی اچھا ہے۔ اور وہی باقی رہنے والا ہے۔"

ہوتے اہلِ جفا مجھ سے خفا تیرے لیے

مخالفتوں، شدید ترین مخالفتوں کے مقابلہ میں بھی رویہ ہے جو انبیاء علیہم السلام اور دوسرے سچے اور مخلص پرستارانِ حق نے ہمیشہ اختیار کیا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مخالفینِ حق محض قوت اور جبر کے ذریعہ انہیں سیدھے راستہ سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ ان پر جو بھی الزامات وہ لگا رہے ہیں وہ سرتا پا جھوٹے ہیں۔ ان کا اصلی "جرم" اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ وہ ان کی بندگی اور غلامی اختیار کرنے کے بجائے صرف خدا کی بندگی اور اطاعت پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کے ظلم و ستم اور غلط کاریوں میں شریک ہونے کی بجائے ان سے براءت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ فساد اور ضلالت پر خاموش رہنے کی بجائے اس پر کڑھتے ہیں۔ اور انسانوں کے خود ساختہ ضابطوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے صرف خدا کے دین کے مطیع بنتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے موقف پر پورے شرحِ صدر کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور اس پر ان کے یقین اور اطمینان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو لوگ ان کے اس جرم پر برافروختہ ہوتے ہیں ان سے صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ

گر یہی اپنی خطا ہے تو خطاوار ہیں ہم

چنانچہ تاریخ انسانی کے ایسے ہی ایک واقعہ کے موقع پر خود اللہ تعالیٰ نے حق پرستوں

کی مخالفت کے اصل سبب کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ (البروج ۸-۹)	اور جو ظلم و ستم، وہ اہلِ ایمان پر ڈھا رہے تھے اسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور مومنوں کے خلاف ان کا سارا غصہ اس بات پر تھا کہ وہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے جو غالب اور قابلِ ستائش ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ کو بھی فرعون کے دربار میں ایسی ہی صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا۔ اس موقع پر ایک مومن آلِ فرعون ارباب اقتدار کی روش پر احتجاج کرتے ہوئے اس حقیقت کا برملا اظہار کرتا ہے کہ:

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ۔ (المؤمن - ۲۸)	کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے۔

یہ ہے اہلِ حق کے موقف اور ان کی مخالفت کے اصل سبب پر خود خالق السموات والارض کی شہادت! دعوت انبیاء کی مخالفت کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ معرکۂ حق و باطل کی اصل بنیاد یہی یہ چیز ہے کہ خدا کے نبی اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے دوسرے مخلص بندے غیر الٰہی نظامِ زندگی کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اس لیے کہ ان کی نگاہ میں دین محض اللہ اللہ پکارنے کا نام نہیں بلکہ پوری زندگی کو خدا کی مرضی کے مطابق گزارنے اور زندگی کے سارے نظام پر شریعتِ الٰہی کو غالب کر دینے کا نام ہے۔ وہ اللہ کے مقابلہ میں کسی اور کی خدائی اور اس کا مطلق اور مستقل بالذات اقتدار ماننے کو تیار نہیں۔ وہ محض "سجدے" کی اجازت پر مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ پوری زمین پر صرف خدا کا کلمہ بلند اور اسی کا قانون جاری و ساری کرنے کی سعی و جہد کرتے ہیں تو وہ اس صورتِ حال کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ خالق تو الٰہ تو اللہ ہو مگر زندگی کے دیگر معاملات میں غیر اللہ سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ لَهُ الخلق والامر (خلق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا)۔ اور مخالفت کے سارے طوفان اسی سبب

اٹھتے ہیں کہ یہ بندگانِ حق ساری انسانی زندگی اور اس کے تمام شعبوں میں صرف ایک ہی خدا کی فرماں روائی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے خدا کی زمین پر بزعم خود اپنی خدائی جتانے کے مدعی آتش زیرپا ہو جاتے ہیں۔

...جلتا رہا لیکن چراغ | تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی خدا کی زمین پر اس کے کچھ بندوں نے اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے اس کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے، حق و باطل کی کشمکش برپا ہو گئی ہے۔ لیکن یہ وہ کشمکش ہے جس میں صرف اہلِ حق ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے معاشرہ اور تمام دنیا کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ کیونکہ یہی وہ جدوجہد ہے جس کی وجہ سے دنیا میں بھلائی قائم ہے۔ اور روئے ارض پر جو بھی نیکی، صداقت، شرافت اور انسانیت پائی جاتی ہے وہ اس کا عطیہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو خدا کی زمین ظلم، بدی اور فساد سے بھر جائے۔

حق و باطل کی اس کشمکش میں بہت سے دور آتے ہیں۔ اسے بہت سے گرم و سرد موسموں سے گزرنا پڑتا ہے۔ خزاں اور بہار کے بہت سے مناظر سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ماہ و سال اور زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ اس کشمکش کی ظاہری شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ جدل و پیکار کے انداز تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس معرکہ کے کرداروں (افراد و قوم) میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے، لیکن اپنی روح، اپنے مزاج اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ازلی و ابدی ہے۔ یہ کشمکش ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ موت و حیات کا یہ ہنگامہ برپا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ تمہیں (انسانوں کو) آزمایا جائے۔ اور دیکھا جائے کہ تم میں سے کون نیک روش اختیار کرتا ہے۔

پھر حق و باطل کی یہ کشمکش مختلف پیمانوں پر ہوتی ہے۔ کبھی یہ صرف انفرادی زندگی تک محدود ہوتی ہے اور کبھی اجتماعی جدوجہد کی شکل اختیار کرتی ہے۔ کبھی چند منفرد حق پرست کلمۂ حق بلند کرتے ہیں اور دار کو چومتے ہوئے اپنے خالق و مالک کے حضور جا حاضر ہوتے ہیں اور کبھی اس فریضہ کو منظم تحریکیں ادا کرتی ہیں۔ کبھی باطل کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں صرف چند ٹوٹے ہوئے چراغ

ضوفشاں ہوتے ہیں اور کبھی نورِ حق ظلمتوں کا سینہ چاک کر کے فضائے بسیط کو منور کر دیتا ہے۔ کبھی اہلِ حق صرف جیلوں اور سولیوں ہی تک رسائی پاتے ہیں اور کبھی گردشِ دوراں کو پلٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور غالب آ کر نظامِ زندگی کی تنظیمِ نو کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ یہ تاریخ کے مختلف نشیب و فراز ہیں اور ان میں سے کب کس کو کونسا مقام حاصل ہوتا ہے، اس کا انحصار صرف تدبیرِ الٰہی پر ہے۔ رہے اہلِ حق تو وہ جانتے ہیں کہ ہر صورت میں وہ کامیاب و کامران ہیں۔ دحق کا اظہار ہی خود حق کا سب سے بڑا انعام بھی ہے۔ یہاں سعی ہی حاصل ہے، سفر ہی منزل ہے، جد و جہد ہی کامیابی ہے۔ قربانی ہی اعزاز ہے اور اس مقصد کے لیے تڑپ ہی کامیابی ہے۔ ... کیا خود آقا ہی نے نہیں کہا ہے کہ اِنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى کہ اس کی سعی و جہد ہی ہے جو دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا (النجم)

دعوتِ انبیاء اور معرکۂ حق و باطل کی برکتیں | پھر اس جد و جہد کے انداز و آداب بھی نرالے ہیں یہاں جو مظلوم ہے بالعموم وہی محبوبِ خلائق بھی بنتا ہے۔ دنیا کا ضمیر بھی اس کی عزت کرتا ہے اور خدا کو بھی وہ بہت پیارا ہوتا ہے۔ دنیا میں کلمۂ حق بلند کرنے والے کا استقبال داد و دہش، عزت و تکریم، انعام و اکرام سے نہیں، سوسائٹی کے مقتدر طبقے کی طرف سے ظلم و زیادتی سے ہوتا ہے اور حق کی تحریک جتنی منظم، جتنی مضبوط و ہمہ گیر ہوتی جاتی ہے، مخالفت بھی اتنی ہی شدید اور مصائب بھی اتنے ہی ناقابلِ برداشت ہوتے جاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر مخالفت کے طوفان نہ اُمڈیں اور غلط کار قوتیں ان کو ٹھنڈے پیٹوں گوارا کر لیں تو دعوت و تحریک کی صحت ہی ایک گونہ مشتبہ ہو جاتے۔ اہلِ باطل کی طرف سے مخالفت جتنی شدید ہو وہ دعوت کی صداقت کا اتنا ہی بڑا ثبوت ہے۔ وہ اس بات کی دلیل ہے کہ تیر نشانے پر لگا ہے[1] دعوت جوں جوں ترقی

[1] حضرت مسیح نے بنی اسرائیل سے کہا تھا:-

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں (باطل کے ساتھ صلح کرانے نہیں (حق کی خاطر) تلوار چلانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے، اور بیٹی کو اس کی ماں سے،

کرتی بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہے۔ مخالفت بھی اسی مناسبت سے شدید ہوتی جاتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہی مخالفت اور کشمکش خود دعوت کا ایک پہلو بن جاتی ہے جس سے پورے معاشرہ میں ایک ہلچل مچ جاتی ہے۔ ہر شخص کسوٹی پر کس دیا جاتا ہے۔ کشمکش کی اصل حقیقت اور معرکہ کا اصل سبب سب کے سامنے آجاتا ہے۔ دعوت کا پیغام اور داعی کا کردار حق کے حسن اور رعنائی کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اہلِ حق سے جو سلوک کیا جاتا ہے اس سے انسانیت کے قلب پر چوٹ پڑتی ہے۔ سوچنے سمجھنے والے ذہن بے چین ہونے لگتے ہیں جن میں خیر و صلاح کی کوئی رمق موجود ہوتی ہے۔ وہ اس صورتِ حال پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان کے ضمیر جاگ اٹھتے ہیں۔ سوئی ہوئی انسانیت بیدار ہو جاتی ہے۔ پھر لوگوں کی ہمدردیاں اور توقعات دعوتِ حق سے وابستہ اور گہری ہوتی جاتی ہیں۔ معاشرہ کے تمام عناصر حقائق کو چشمِ سر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ سوسائٹی میں سے زندہ ضمیر رکھنے والے لوگ چھٹ چھٹ کر اہلِ حق کے ساتھ شامل

اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہونگے۔ جو کوئی ماں باپ کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے (یعنی سر لئے موت کے لیے تیار نہ ہو اور اپنا سر ہتھیلی پر لے کر نہ نکلے) وہ میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔
جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا، اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا ۔" (متی ۱۰ : ۳۴-۳۹)

بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالہ کرے گا۔ اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔ (متی ۱۰ : ۲۱-۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں ... آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے۔ اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے (ایضاً ۱۶-۱۸)

ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہمت اور عزم رکھنے والے معرکہ میں جوق در جوق شریک ہونے لگتے ہیں۔ ہر طرف سے کلمۂ خیر بلند ہونے لگتا ہے۔ اصلاح کی تحریک کو نیا خون اور نئی قوت حاصل ہوتی ہے ۔ اس طرح سے مخالفین گویا اس خام کو کندن بنانے کا کام کرتے ہیں۔ لوہا فولاد میں تبدیل ہوتا ہے۔ اور یہ فولاد بالآخر باطل کے ہتھیاروں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے کوئی نہیں جانتا کہ یہ کشمکش اپنے پورے نتائج کتنی مدت میں نکالے گی۔ اثر و نفوذ اور اتمامِ حجت کا عمل کتنا عرصہ لے گا۔ درخت کب اپنے پھلوں سے شاد کام کرے گا۔ اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں کب انسانیت کے لیے آرام گاہ بنے گی لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس کشمکش پر ہی انسانی سوسائٹی کی زندگی اور اس کے نشو و نما اور ارتقار کا دار و مدار ہے ۔

حق و باطل کی کشمکش پورے معاشرہ میں ایک نئی روح پھونک دیتی ہے۔ خیر و صلاح کی تمام قوتوں کو، خواہ وہ کہیں بھی اور کسی بھی شکل میں کام کر رہی ہوں، اس سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ پسے ہوئے انسانوں میں امید کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ اصلاح و تعمیر کی ایک نئی رو اُبھرتی ہے۔ ساری مزاحمتوں کے باوجود یہ دعوت پورے معاشرہ کے لیے امید کی کرن اور خیر کا منبع بھی بن جاتی ہے۔ چونکہ تحریکِ اصلاح کی مخاطب پوری قوم ہوتی ہے۔ اس لیے دعوتِ حق کے برپا ہونے اور کشمکش کے شدت اختیار کرنے کے ساتھ ہی ساری قوم جاگ اٹھتی ہے اور اس کے سامنے یہ سوال آجاتا ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے یا باطل کا، یا صرف خاموش تماشائی بن کر کھڑی رہے ؟ خدا کی سنت یہ ہے کہ جو معاشرہ صالح افراد کی ایک معقول تعداد رکھتا ہے، (ضروری نہیں کہ یہ عددی اکثریت ہی میں ہوں) اور صالح افراد منتشر حالت میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے ہوں بلکہ ایک دوسرے کے رفیق و مددگار اور دعوتِ انبیاء کے علم بردار بن کر اٹھ کھڑے ہوں اور اس کے لیے جان و مال کی بازیاں لگا دیں اور اس جدوجہد میں اعلیٰ اخلاقی کردار کا مظاہرہ کریں تو پھر دعوتِ حق غالب آکر رہتی ہے اور باطل اپنی ظاہری آب و تاب اور قوت و دبدبہ کے باوجود مغلوب ہو کر رہتا ہے۔ اس کے برعکس

اگر کوئی معاشرہ اتنا بانجھ ہو گیا ہے کہ اس میں حق پرستوں کا کوئی گروہ موجود ہی نہ ہو یا موجود تو ہو مگر اصلاحِ حال کی خاطر کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر اس قوم کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ قانون ہے کہ بدی اور ظلم خالص کا نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا کسی قوم میں دعوتِ حق کا برپا ہونا اور اس کے اندر سے کچھ لوگوں کا نظامِ حق کو قائم کرنے، نیکیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کی جد و جہد کے لیے اٹھ کھڑا ہونا اس قوم اور معاشرے کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ اس کا حفاظتی حصار ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہتی اور پروان چڑھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ۔

(ہود ۱۱۶-۱۱۷)

پھر کیوں نہ ان قوموں میں سے جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم جن کو ہم نے ان قوموں (کے انجام) سے بچا لیا۔ ورنہ ظالم لوگ تو ان چیزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔

مضبوط ہمہ گیر جد و جہد کی برکات حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کی جد و جہد جو مضبوط، قوی، مؤثر اور ہمہ گیر جد و جہد ہو، ایک معاشرہ کی زندگی کی ضامن اور اس کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اسی کے سہارے اس کی مدتِ حیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں خیر و صلاح اور نیکی اور معروف کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی اخلاقی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور اصلاحِ حال اور تعمیرِ نو کے امکانات روشن تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جوں جوں تحریکِ اصلاح

فروغ پائے اور کشمکش گہری ہو۔ معاشرہ اور قوم کی طرف سے ردعمل بھی اتنا ہی مؤثر اور قوی ہوتا جائے تاکہ خیر و صلاح کے کام کو قوت حاصل ہو اور مالکِ کائنات (جس کے نزدیک اس کی ذات اور اس کے حکم میں کسی اور کو شریک کرنے سے بڑا کوئی جرم نہیں) کی رحمت قوم کی طرف متوجہ اور اس کی پشت پناہ بنے۔

جبر و تشدد کی شکست مقدر ہے ایک خاص مقام تک دعوتِ حق اور مخالفت دونوں ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں۔ جوں جوں دعوت دین کی روشنی پھیلتی ہے، اور حق ظاہر اور اس کے غلبہ کے امکانات تابندہ ہوتے جاتے ہیں اور تحریکِ اصلاح قوت پکڑتی جاتی ہے اس کے بالمقابل عناصر کی کمزوریاں نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ اس سے ان کی جھنجلاہٹ بڑھتی اور مخالفت تیز ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ بالکل اندھے ہو کر انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو طاقت اور جبر کے ذریعہ کچلنے کے درپے ہو جاتے ہیں لیکن وہ جتنا اس خطرناک راہ پر آگے بڑھتے ہیں اتنا ہی ان کے موقف کا بودا پن واضح ہو جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جبر و تشدد کے ہتھیاروں سے اخلاقی مجرموں کو مغلوب کیا جا سکتا ہے مگر فکری اور نظریاتی تحریکوں کو کبھی دبایا نہیں جا سکا۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیرووں کی قیادت میں اُٹھنے والی تحریکیں تو درکنار خیالات اور نظریات کی اساس پر اٹھنے والی کسی تحریک کو بھی محض زور اور قوت اور جبر و تشدد کے بل پر نہیں روکا جا سکا۔ قوت کے ذریعہ سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا جا سکتا ہے۔ لیکن یونان کو سقراط کے افکار سے نہیں بچایا جا سکتا۔ سقراط آج بھی زندہ ہے اور اسے زہر کا پیالہ پلانے والوں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ اور جو جانتا ہے وہ ان پر لعنت بھیجتا ہے۔ کنفوشس کو پھانسی دی جا سکتی ہے لیکن دینِ کنفوشس کے فروغ کو روکا نہیں جا سکتا۔ کنفوشس کا مذہب آج بھی ایک مؤثر قوت ہے اور اس کے قاتلوں کو زمانے نے "تاریخِ انسانی کا مجرم" قرار دیا ہے۔ حضرت مسیحؑ کو صلیب تک لے جایا جا سکتا ہے۔ اُن کی مقدس تعلیمات کے غلبہ کو روکا نہیں جا سکتا۔ وہی رومن ایمپائر جس کی عدالت حضرت مسیحؑ کو پھانسی کی سزا کا حکم سناتی ہے، بالآخر دینِ مسیح کے لیے مسخر ہو جاتی ہے۔ اور

عیسائیت ریاست کا سرکاری مذہب بنتی ہے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا جا سکتا ہے۔ اور مکہ سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن محمدؐ اور دین محمدیؐ کے غلبہ و اقتدار کو نہیں روکا جا سکتا ۔ مکہ سے نکالے جانے والا بھی غریب الوطن (فداہ امی وابی) دس ہی سال کے اندر فاتح مکہ کی حیثیت سے اپنے مسکن و مولد میں داخل ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام حنبل اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ کو قید و بند اور کوڑوں کی سخت سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن بالآخران ہی کے افکار و نظریات کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور خود سلطنتوں کو ان کی اسی فکر کے آگے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔

تاریخ کا یہ ناقابلِ فراموش فتویٰ ہے کہ جبر و تشدد کے ذریعہ دعوتِ انبیاء اور تحریکاتِ حق کا راستہ کبھی نہیں روکا جا سکا ہے۔ اس سے دعوت اور مضبوط ہوتی ہے۔ معاشرہ کے باضمیر عناصر اس سے آ آکر ملتے جاتے ہیں۔ ظالموں کے مجرم ضمیر خود ان کے لیے زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ اخلاص، اعلیٰ کردار اور بلند اخلاق اپنا لوہا منواتے ہیں۔ اور اہلِ حق آخرت میں تو کامیاب و بامراد ہوں گے ہی لیکن اسی دنیا میں بھی وہ کامیاب و بامراد ہو کر رہتے ہیں۔

<u>جو حق کی خاطر جیتے ہیں</u> | حق و باطل کی یہ کشمکش جس قدر حق کی مخالفت کرنے اور اس سے بے اعتنائی برتنے والوں کے امتحان کے لیے اور دنیا و آخرت میں ان کا ٹھیک مقام متعین کرنے کے لیے ضروری ہے، اسی قدر یہ خود اہلِ حق کی تربیت کے لیے بھی ضروری ہے۔ یہ ایک طرف ان کے ایمان و میثاق کا امتحان ہے اور دوسری طرف ان سے خدا کے وعدے کی تکمیل۔ دنیا کا قانون یہ ہے کہ محض زبانی دعوے پر کوئی مکمل اعتماد نہیں کرتا۔ زبانی دعوے کا عملی ثبوت بھی مانگا جاتا ہے۔ اور یہ عملی ثبوت ہی ہے جو دعوے کو معتبر بناتا ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ اہلِ حق کے دعوائے ایمان کو عمل کی دنیا میں جانچے اور پرکھے بغیر ان کے مراتب کے بارے میں کیسے فیصلہ فرما دے؛ چنانچہ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ:۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (العنکبوت ۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں۔ جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون!

دوسری جگہ فرمایا:-

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۔ (آل عمران)

خدا مومنوں کو ہرگز اس حالت میں رہنے دینے والا نہیں ہے کہ جس میں تم اس وقت ہو (کہ صادق الایمان اور منافق ملے جلے ہیں)۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ نمایاں کر کے رہے گا۔

اس عمل کا صرف یہی پہلو نہیں ہے کہ یہ حق پرستی کا دعویٰ کرنے والوں کی آزمائش اور ان کا امتحان ہے۔ اور اس کے ذریعہ مخلص اور غیر مخلص، اصحابِ استقامت اور موقعہ شناس و مفاد پرست ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں بلکہ یہ دعوتِ حق کے لیے تطہیر کا ایک خدائی انتظام ہے جس سے کائنات کا حقیقی فرمانروا سچے اہلِ ایمان اور محض زبانی جمع خرچ کرنے والوں کو ایک دوسرے سے ممیز و ممتاز کر دیتا ہے اور اہلِ حق کے گروہ میں صرف ان کو رکھتا ہے جو فی الحقیقت اپنے کو اپنے رب کے ہاتھ بیچ چکے ہوں جو در اصل اس کے کام کے ہوں، جو اس کی خاطر دو عالم سے ٹکرانے کو تیار ہوں۔

آزمائش کا یہ انتظام اہلِ حق کے لیے بے شمار پہلوؤں سے ایک تربیتی نظام بھی ہوتا ہے۔ اس معرکہ میں دعوتِ اسلامی کی اصل خصوصیات اور اس کا حقیقی رنگ خود ان کے سامنے نکھر کر آجاتا ہے۔ کتابی باتیں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اور مصائب و شدائد کی کٹھالی میں ان سے ان کی آلائشوں کو دور کیا جاتا ہے اور انہیں نکھار کر پاک و صاف کر دیا جاتا ہے دنیا

اور اس کی ترغیبات سے جو لگاؤ ان کے اندر پیدا ہو گیا ہوتا ہے، اس کا تزکیہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی اخلاقی طاقت کو کئی گنا بڑھا دینے کا سامان ہو جاتا ہے۔

یہ وہ عمل ہے جس سے اہلِ حق کے لیے قوت کے نئے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ان میں قیادت کی اعلیٰ صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہ جوہر بیدار کیا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے تاریخ میں بار بار حق پرستوں کا ایک چھوٹا سا گروہ ایک بڑے ہجوم پر غالب ہوتا رہا ہے . . . . .

پھر آزمائش اہلِ حق کے ایمان کو پختہ کرتی ہے۔ اور ان کا اپنے مشن کی کامیابی اور نصرت الٰہی پر یقین اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ جس آزمائش اور امتحان کی خدا نے خبر دے رکھی ہے، جب وہ آتا ہے تو خدا کے وعدوں پر ان کا یقین اور بڑھ جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جس طرح خدا کی دی ہوئی یہ خبریں سچی ثابت ہو رہی ہیں اسی طرح وہ اپنے باقی وعدے بھی پورے فرمائے گا اور بالآخر حق کو غلبہ اور اہلِ حق کو کامیابی عطا کرے گا۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۔ (الاحزاب۔ ۲۲)	اور جب مومنوں نے (مخالفینِ حق کے) لشکر کو دیکھا تو پکار اٹھے یہ وہی ہے جس کا خدا اور اس کے پیغمبر نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور خدا اور اس کے پیغمبر نے سچ کہا تھا ۔۔۔ اور ان کا ایمان اور اطاعت اور زیادہ ہو گئی ۔

چنانچہ سخت سے سخت پریشان کن حالات میں بھی اہلِ حق مایوس نہیں ہوتے۔ ہر آزمائش میں اللہ کے بھروسے پر راہِ حق پر جمے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات پر ان کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا کہ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم ہے۔ (الروم۔ ۴۷)

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ	اور ایک اور چیز جس کو تم بہت پسند کرتے ہو (وہ) بھی تمہیں ملے گی یعنی، خدا کی طرف سے تمہیں

(الصّٰفّٰت-۱۳) مدد اور عنقریب فتح نصیب ہو گی اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنا دو۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ (المومن) پس صبر کرو، خدا کا وعدہ بالکل سچا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اہلِ حق اپنے خدا پر ہر حال میں بھروسہ رکھتے ہیں انتظار سے گھبراتے نہیں۔ صبر و استقامت کی روش پر جمے رہتے ہیں۔ تنگی ہو یا فراوانی۔ حالات مساعد ہوں یا نامساعد، کام کی راہیں بظاہر کھلی ہوں یا بند، وہ دل شکستہ نہیں ہوتے۔ بلکہ راہ میں مشکلات کو حائل پاکر اپنے رب سے اپنے تعلق کو اور زیادہ گہرا اور خالص کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اپنی ساری قوتیں راہِ وفا میں جھونک دیتے ہیں۔ صبر و صلوٰۃ سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ استغفار و دعا سے روحانی غذا پاتے ہیں۔ مہر و وفا اور الفت و محبت سے اپنی صفوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ اور اپنے اپنے حالات و استطاعت کے مطابق اپنے مالک کی رضا جوئی کی راہ پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ منزل آجاتی ہے کہ خدا کی زمین باطل کی شر انگیزیوں سے پاک اور حق و انصاف کا مسکن بن جاتی ہے۔

مطبوعات

<u>فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ</u> | تالیف: شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ۔ شارح: مولانا محمد عبدالحلیم چشتی۔ ناشر: نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی۔ قیمت: قسم اول پندرہ روپے۔ قسم دوم بارہ روپے۔ صفحات ۵۷۶۔

اس خیر الامم پر فلاکت و ادبار کا ایک وقت وہ بھی آیا جب اس نے علم حقیقی یعنی قرآن و سنّت سے روگردانی کر کے اپنی تمام تر توجہ منطق و فلسفہ، ہیئت و کیمیاء اور اسی قبیل کے دوسرے علوم پر صرف کر دی جن کو وہ بزعمِ خویش علومِ عقلی سے تعبیر کرتے تھے۔ فقہ اگرچہ پڑھی جاتی تھی تاہم بالعموم محض سرکاری ملازمت کے حصول کے لیے۔ چنانچہ علامہ رشید رضا ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "لولا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال من أمصار الشرق فقد ضعفت في مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتى بلغت منتهى الضعف في أوائل هذا القرن الرابع عشر۔" (ہمارے بھائی ہندوستانی علماء اگر اس زمانے میں علومِ حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو مشرقی ممالک سے یہ علوم ختم ہو چکے ہوتے کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے یہ علوم ضعف کا شکار ہو چکے تھے اور چودھویں صدی کے اوائل تک ضعف کی آخری منزل تک پہنچ گئے تھے)۔ قرآن و سنّت سے بے اعتنائی کے دوسرے نقصانات جو پہنچے سو پہنچے، سب سے بڑا نقصان یہ پہنچا کہ امتِ محمدی علیٰ صاحبہا افضل التحیات والتسلیمات کے مراکزِ احترام و عقیدت کے بدل جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ صحیح و غلط کے معیار زیر و زبر ہونے لگے۔ عقائد کا ڈھانچہ لرزنے لگا۔ قرآن و سنّت کی ایک ایک بات کو ماننے کے لیے عقلی ثبوت طلب کیے جانے لگے لیکن اس کے برعکس علمائے یونان کا ہر کہا بلا حیل و حجت تسلیم کیا جاتا تھا۔ اہلِ علم و دانش کی اس

گمراہی کو دیکھ کر ہی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ چیخ اٹھے کہ "یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیتِ محکم کا نام ہے یا سنتِ ثابتہ قائمہ کا۔"

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس برصغیر کے مرکزی مقام دہلی میں ایک پورا خاندان ایسا پیدا کر دیا جس نے قریب قریب دو صدیوں تک قرآن و سنت اور فقہ و تفسیر کا غلغلہ بلند کیے رکھا۔ یوں تو یہ پورا کا پورا خاندان ہی ایک سلکِ مروارید تھا جس کا ایک ایک فرد اپنے علم و فضل اور زہد و اتقاء میں بے مثال تھا لیکن علوم و فیوض بالخصوص علمِ حدیث کا جو چشمۂ فیض حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات سے جاری ہوا، اس کا اندازہ اس برصغیر کے چپے چپے میں پھیلے ہوئے ان کروڑوں اساتذۂ حدیث سے کیا جا سکتا ہے جن کا سلسلۂ سند حضرت شاہ صاحب پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے علمِ حدیث میں دو تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ایک بستان المحدثین، جس میں حدیث کی مشہور کتابوں اور ان کے مؤلفین کے حالات کا تذکرہ ہے۔ اور دوسری کتاب ان کا ایک رسالہ ہے جو عجالۂ نافعہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا ترجمہ و حواشی اس وقت زیر نظر ہیں۔

شاہ صاحبؒ کا یہ رسالہ جس میں صحاح ستہ، مشکوٰۃ شریف اور حصن حصین کی اسناد کے بیان کے علاوہ فنِ حدیث سے متعلق کچھ متفرق معلومات درج کی گئی ہیں، اپنے زمانۂ تالیف سے لے کر آج تک طلبہ و اساتذہ اور عام شائقینِ حدیث میں بہت مقبول رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رسالہ دہلی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ مختلف مقامات پر بار بار چھپتا رہا ہے۔

اب نور محمد والوں نے "فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ" کے نام سے اس رسالے کو بڑے اہتمام سے ترجمہ و حواشی کے ساتھ پھر شائع کیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے رسالے کا متن ہے جس کی تصحیح فاضل دیوبند جناب مولانا محمد عبدالحلیم صاحب چشتی نے فرمائی ہے۔ پھر انہی کے قلم سے فارسی متن کا سلیس اردو ترجمہ ہے اور اس کے بعد نہایت مفصل حواشی۔ آخر میں ایک صحت نامہ

بھی شاملِ کتاب کیا گیا ہے جس میں علاوہ اغلاط کتاب کی تصحیح کے کچھ نوٹس بھی شامل کیے گئے ہیں۔

(بقیہ اشارات)

یہ دونوں طبقے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ملک و ملت کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ ضمیر فروشی، خود غرضی، اقتدار پرستی سیرت و کردار کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں جب کسی فرد یا گروہ کو چھوٹے چھوٹے دنیاوی فوائد کا لالچ دے کر اپنے ایمان کو بیچنے کی مشق کرائی جائے تو پھر یہی کمزوری اس کے اندر پوری طرح جڑ پکڑ جاتی ہے اور وہ کسی اونچے منصب اور کسی بڑے فائدے کے لیے بسا اوقات پوری قوم کے مفاد کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب سماج دشمن عناصر کی پشت پناہی کر کے اُن سے مخالفوں کو مرعوب کرایا جائے تو پھر یہ عناصر بالکل بے لگام ہو کر نہ صرف عوام کے لیے پریشانی کا موجب بنتے ہیں بلکہ خود برسرِ اقتدار طبقوں کے لیے بھی وبالِ جان بن جاتے ہیں۔

ضروری اعلان

(۱) منصبِ رسالت نمبر کی چند کاپیاں دفتر میں موجود ہیں جن کو ۵۰/ ۳ روپے کی بجائے صرف دو روپے میں معہ خرچہ ڈاک منگوایا جاسکتا ہے۔

(۲) ترجمان القرآن کے پرانے پرچے از جون ۴۸ء تا اکتوبر ۶۳ء دفتر میں غیر مسلسل موجود ہیں۔ ۳/ فی کاپی کے حساب سے جن اصحاب کو ضرورت ہو منگوا سکتے ہیں۔

مینجر ترجمان القرآن۔ اچھرہ، لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰